ISSN 2321-4627

نومبر 2022ء

-/15 روپے

ماہنامہ

قومی زبان

حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی وسائنسی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

مولانا ابوالکلام آزادؒ

تاریخ پیدائش: 11/نومبر 1888ء

علامہ اقبالؒ

تاریخ پیدائش: 9/نومبر 1877ء

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی
محکمہ اقلیتی بہبود، حکومت تلنگانہ

TELANGANA STATE URDU ACADEMY

4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001(TS) India.
Minorities Welfare Department, Government of Telangana
ISO 9001: 2015 Certified Organisation

عالیجناب کے۔ چندراشیکھر راؤ
عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ

جناب محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

جناب کوپّولہ ایشور
عزت مآب وزیر برائے شیڈولڈ کاسٹ ڈیولپمنٹ، اقلیتی بہبود و بہبودیٔ معذورین و معمر شہریان
حکومت تلنگانہ

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی ایک ادبی ادارہ ہے۔ اس کے قیام کا مقصد ریاست میں اُردو زبان وادب کے فروغ، ترقی، تحفظ وترویج کے لئے کام کرنا ہے۔ اُردو اکیڈیمی کی سرگرمیاں ادبی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی ہیں۔ حکومت تلنگانہ اُردو زبان وادب اور تہذیب کے تحفظ اور ترقی کے علاوہ شادی خانوں کی تعمیر کے لئے فنڈز منظور کرتی ہے۔

اُردو کے فروغ، ترقی وترویج کے سلسلہ میں تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کی اسکیمات

- ☆ ادبی ماہنامہ ''قومی زبان'' کی اشاعت
- ☆ مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ
- ☆ کارنامہ حیات ایوارڈ (مجموعی خدمات پر انعامات)
- ☆ بیسٹ اُردو ٹیچر ایوارڈ
- ☆ اُردو ادیبوں، اسکالروں اور شعراء کی تخلیقات کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت
- ☆ اُردو میڈیم کی نصابی کتابوں کی اشاعت
- ☆ اُردو خبر رساں اداروں کو مالی امداد
- ☆ اُردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام مشاعرے، سمینار، سمپوزیمس، تہذیبی اور ثقافتی پروگرامس
- ☆ گرمائی تعطیلات میں اُردو پڑھانے اور سکھانے کے لئے رضا کارانہ تنظیموں اور اداروں کی مالی اعانت
- ☆ اُردو الیکٹرانک میڈیا جرنلسٹس کی مالی اعانت
- ☆ اُردو قلم کاروں اور صحافیوں کی مالی اعانت
- ☆ اُردو کیلنڈرس، ڈائری اور بروچرس کی اشاعت
- ☆ اُردو گھر شادی خانوں کی تعمیر
- ☆ مختصر مدتی آن لائن اُردو بنیادی کورس
http://ecourse.urduacademyts.com
- ☆ مخدوم ایوارڈ
- ☆ اُردو کی شائع شدہ مطبوعات پر انعامات
- ☆ بیسٹ اُردو اسٹوڈنٹ ایوارڈ
- ☆ اُردو کتابوں کی اشاعت
- ☆ اُردو لائبریریز کو کتابوں کی فراہمی
- ☆ چھوٹے اُردو اخبارات کی مالی اعانت
- ☆ چھوٹے اُردو اخبارات کو اشتہارات کی اجرائی
- ☆ اُردو مشاعرے، سمینارس، سمپوزیمس، تہذیبی اور ثقافتی پروگرامس کے لئے رضا کارانہ تنظیموں اور اداروں کی مالی اعانت
- ☆ سرکاری اُردو مدارس کو انفراسٹرکچر کے لئے مالی اعانت
- ☆ اُردو رسائل وجرائد کی مالی اعانت
- ☆ قومی اردو اخبارات و اردو چیانلس کو اشتہارات کی اجرائی
- ☆ اُردو اکیڈیمی کے جزوقتی بک اسٹالس

ڈائرکٹر / سکریٹری

جاری کردہ: شعبہ تعلقات عامہ تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

Phone No. 040-23237810
Email : urduacademyts@gmail.com Website : urduacademyts.com

قرینہ

ہم کلامی	شاہ نواز قاسم آئی پی ایس ڈائرکٹر/سکریٹری	4
اپنی بات	محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی	5

گوشۂ آزاد

زمانہ قدیم میں کبوتروں کی ڈاک	مولانا ابوالکلام آزاد	6
سیکولر ہندوستان کے معمار مولانا آزاد	ڈاکٹر سید نجی اللہ	14
عصر حاضر میں مولانا آزاد کی تعلیمی فکر اور اس کی افادیت	محسن خان	18
فکر آزاد آج کی اشد ضرورت	محمد خوشتر	22

گوشۂ اقبال

فکر اقبال میں مقام زن	ڈاکٹر محمد طیب علی	29
علامہ اقبالؔ کا تصور فن	فردوس احمد بھٹ	34

تعلیم و روزگار

ڈیجیٹل لرنینگ کے دور میں اساتذہ کا کردار	روش انجم و ڈاکٹر اشوینی	38
ہندوستان کی عصری یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے	مفتی محمد صلاح الدین ایوبی	46

بچوں کا ادب

اُردو میں بچوں کا ادب۔ آغاز و ارتقاء	ڈاکٹر شیخ عبدالکریم	51

مضامین

ولی دکنی کی غزلوں میں تدبھو اور تت سم	اے۔ آر۔ منظر	55
کیرلا کے بابائے اردو: سید محمد سرورؔ	محمد امان اے کے	63
عفت موہانی۔ اردو فکشن نگاری کا ایک مقبول نام	حمیدہ بیگم	68

سائنس و ٹکنالوجی

ہائیڈروجن فیول سیل گاڑیاں	محمد احمد خان	71

افسانے

یہ پری چہرہ لوگ	غلام عباس	74
صندل ہاتھ	شہانہ اقبال	77

حصہ نظم

غزلیں	صلاح الدین نیرؔ، قاضی فاروق عارفی	81
	ڈاکٹر راہیؔ، فصیح احمد ساحرؔ	82

oOo

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد: 07 شمارہ: 11 نومبر 2022ء

زیر نگرانی

محمد خواجہ مجیب الدین

صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ایڈیٹر

شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس

ڈائریکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی

حیدرآباد-500 001 (تلنگانہ)

مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب و تزئین : محمد ارشد مبین زبیری

کمپوزنگ، ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت **-/15** روپے سالانہ **-/150** روپے

Total Pages : **84**

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Shah Nawaz Qasim and published by Shah Nawaz Qasim on behalf of Telangana State Urdu Academy Minorities Welfare Dept., Government of Telangana. Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.

Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

ہم کلامی

ماہ نومبر 2022ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس شمارے کی ابتداء ہم نے 11 نومبر کو عظیم مجاہد آزادی' مایہ ناز خطیب' مفسر قرآن اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی یوم پیدائش کے موقع پر منائے جانے والے ''یوم قومی تعلیم'' کے ضمن میں ''گوشہ آزاد'' کے زیر عنوان مولانا آزاد کے علمی و سماجی کارناموں کو محیط ممتاز ادبا و اسکالرس کے مضامین سے کی ہے۔ علامہ اقبال کے علمی اور شعری کارناموں کے اعزاز میں ہر سال ''عالمی یوم اردو'' منایا جاتا ہے' اس شمارے میں علامہ کی رہنمایانہ شاعری اور ان کی قومی اور ملی خدمات' پر 'گوشہ اقبال'' کے تحت دو مضامین شائع کئے گئے ہیں' ان گوشوں کے ساتھ ''تعلیم و روزگار'' کے عنوان کے تحت دو مضامین' ''بچوں کا ادب'' کے تحت ایک مضمون'' سائنس و ٹکنالوجی'' کے تحت ایک مضمون' اسی طرح دیگر مضامین میں ولی دکنی' کیرالا کے بابائے اردو سید محمد سرور اور عفت موہانی پر مضامین شامل اشاعت ہیں۔ علاوہ ازیں حسب معمول افسانوں میں ممتاز افسانہ نگاروں کے دلچسپ افسانے اور آخر میں ممتاز شعرائے کرام کا کلام شائع کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ شمارہ قارئین' ادبا و شعراء کے ساتھ ساتھ ہمارے عزیز محبان اردو کی معلومات اور دلچسپیوں میں اضافے کا باعث بنے گا۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی خصوصی مواقع پر اپنے ترجمان ''قومی زبان'' کے کئی خاص نمبر شائع کر چکی ہے۔ اسی سلسلہ کی کڑی کے طور پر ماہ اکتوبر 2022ء کا شمارہ بھی ''اردو کے غیر مسلم ادبا و شعراء'' کے نام سے شائع کیا گیا تھا جس کی ہر ادبی حلقہ سے پذیرائی ہو رہی ہے۔ خطوط' فیس بک اور واٹس ایپ پر مبارکبادی اور ہمت افزائی کے پیامات وصول ہو رہے ہیں۔ ہم ان تمام بہی خواہوں کے شکر گزار ہیں۔ ہماری ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اپنے قارئین اور محبان اردو کے لئے موقع بہ موقع ایسے خصوصی شمارے پیش کرتے رہیں جس سے لوگوں کا شغف اردو زبان کی طرف بڑھے اور اردو کی ترقی کی راہ میں یہ چیزیں معاون ثابت ہوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف ایک قومی قائد اور مجاہد آزادی تھے بلکہ وہ ایک زبردست علمی شخصیت اور ماہر تعلیم بھی تھے۔ بلاشبہ یہ ان ہی کی ماہرانہ علمی صلاحیت تھی جس کی بناء ہندوستان کی آزادی کے بعد تعلیم کی جدید اصلاحات ہوئیں اور تعلیمی ترقی کے سلسلہ میں کئی ادارے قائم ہوئے جن میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن' آل انڈیا کونسل برائے سیکنڈری ایجوکیشن' سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن' آل انڈیا کونسل برائے ٹیکنیکل ایجوکیشن' تعلیم بالغان' دیہی اعلیٰ تعلیم' سنٹرل ایجوکیشن بورڈ' ایجوکیشنل اینڈ ووکیشنل گائیڈنس بیورو اور بھی کئی تعلیمی ادارے مولانا آزاد کی سرپرستی میں قائم ہوئے۔ اس طرح مولانا آزاد کی زبردست علمی و قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے آج ہمارے ملک کے تعلیمی میدان کے وقار میں اضافہ ہوا۔

علامہ اقبال بھی ایک قومی شاعر اور قوم و ملت کے عظیم رہنما تھے' انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ملک کے حالات و قوم کے سدھار کی کوشش کی۔ بہر حال اردو اکیڈیمی اپنے اسلاف کے علمی' قومی' سماجی و رفاہی کارناموں کو اپنے ترجمان ''قومی زبان'' کے ذریعہ آپ کے سامنے لانے اور اپنے رسالے کو مزید معیاری بنانے کے لئے کوشاں ہے' اس میں ادبا و شعراء و محبان اردو کے تعاون و اشتراک کی ضرورت ہے۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی اپنے ادبی سفر کے ساتھ ساتھ فروغ اردو کے دیگر کاموں میں مصروف عمل ہے۔ اکیڈیمی حکومت تلنگانہ کی تفویض کردہ اسکیمات کی عمل آوری بھی کر رہی ہے اس خصوص میں معلنہ اسکیمات میں تقریباً اسکیمات پر عمل آوری ہو چکی ہے جن میں چھوٹے اردو اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کے نمائندوں کو سال 22-2021 کی سالانہ مالی اعانت' 2019 اور 2020 کے مطبوعات پر انعامات اور 2020ء کے اردو مصنفین کی کتابوں کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت کی رقم جاری کر دی گئی ہے اور یہ رقم مذکورہ اسکیمات کے استفادہ کنندگان کے اکاؤنٹس میں جمع ہو جائے گی۔ اسی طرح دیگر معلنہ اسکیمات کی عمل آوری کا کام بھی جاری ہے۔ امید ہے کہ بہت جلد ان اسکیمات کی بھی تکمیل کر دی جائے گی۔

شاہ نواز قاسم آئی پی ایس
ایڈیٹر

اپنی بات

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں سیکڑوں ہزاروں مجاہدین آزادی ہیں جنھوں نے اپنی جانوں کی قربانیاں دی' جیلوں کی صعوبتیں برداشت کیں' ملک بدر ہوئے' کئی مجاہدین کو کالے پانی کی سزائیں ہوئیں' جب جاکر ہمارا ہندوستان جنت نشان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا اور ہمارے ملک کا غیر جانبدار قانون بنا' ہر طبقے اور ہر مذہب کے ماننے والوں کو ان کی اپنی تہذیب' معاشرت اور کلچر کے ساتھ زندگی گزارنے کی آزادی ملی' تعلیم و روزگار کے مواقع حاصل ہوئے۔ جواہر لال نہرو کی قیادت میں ملک کی پہلی جمہوری حکومت تشکیل دی گئی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عظیم مجاہد آزادی اور ماہر تعلیم کو مرکزی حکومت میں تعلیم کی وزارت دی گئی۔ اس ذمہ داری کو انہوں نے پوری دیانت داری کے ساتھ نبھایا اور ابتدائی تعلیم سے لے کر ڈگری اور اعلیٰ تعلیم میں زبردست اصلاحات کیں' یو جی سی اور دیگر ادارے قائم کئے۔ غرض ان اصلاحات کے ذریعہ مولانا آزاد نے ہندوستان میں تعلیمی انقلاب لایا اور آزادی سے لے کر آج تک مولانا آزاد کے قائم کردہ یہ ادارے تعلیم کو عام کرنے اور تعلیم کے میدان میں ترقی کے ضامن ہیں۔

یہ بات میرے علم میں ہے کہ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی خاص موقعوں پر اپنے ترجمان ماہنامہ قومی زبان کے خصوصی شمارے شائع کرتی ہے جن میں مجاہدین آزادی' ماہرین تعلیم و روزگار' اردو کے دانشوروں' ادیبوں' شاعروں اور اسکالرس پر معیاری مضامین شائع کرتی ہے' اسی طرح کبھی کسی شمارے میں خصوصی گوشے بھی شائع کرتی ہے۔ اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے اس ماہ کے شمارے میں بھی عظیم مجاہد آزادی و ماہر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش کے مہینے میں ''یوم قومی تعلیم'' کے موقع پر ان کی یاد میں ایک گوشہ رکھا گیا ہے جس کے تحت ادباء و اسکالرس کے مضامین شائع کئے گئے ہیں' اس کے علاوہ ماہ نومبر شاعر مشرق علامہ اقبال کی بھی پیدائش کا مہینہ ہے' اُن پر بھی ایک گوشہ رکھا گیا ہے جس کے تحت دو مضامین شائع کئے گئے ہیں' ان گوشوں میں شائع مضامین میں آپ کو ان دونوں عظیم شخصیتوں کے مجاہدانہ سیاسی' سماجی' علمی و شعری کارناموں کی تفصیل مل جائے گی۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی ادبی و ثقافتی کاموں کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کے تحفظ' ترقی' ترویج اور فروغ کے کام بھی کرتی ہے' اس ضمن میں حکومت تلنگانہ کی اردو زبان کی ترقی کے لئے جاری کردہ اسکیمات پر عمل آوری کا کام جاری ہے' اردو اکیڈیمی نے اپنی اسکیمات میں سے اردو مصنفین کو کتابوں کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت' اردو کی طبع شدہ کتابوں پر انعامات' چھوٹے اردو اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا والوں کو سالانہ مالی اعانت کی منظوری دے دی گئی ہے۔ دیگر معلنہ اسکیمات کی عمل آوری کا کام جاری ہے امید کہ یہ اسکیمات بھی جلد تکمیل کو پہنچ جائیں گی۔ بہرحال ہماری کوشش ہوگی کہ اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ اس خصوص میں ماہرین' دانشوران اردو اور اساتذہ کرام سے مشورہ بھی کیا جائے گا۔

آخر میں میری آپ تمام محبان اردو سے گزارش ہے کہ اردو زبان و ادب کے فروغ کی ہر کوشش کا ساتھ دیں' اردو کو عام کریں' اپنی زبان کی بقا کے لئے خود بھی اردو سیکھیں اور اپنے بچوں کو بھی اس زبان سے واقف کروائیں' انہیں دوسری زبانوں کے ساتھ اردو بھی لازمی طور پر پڑھائیں۔ اس لئے کہ اردو ہم سب ہندوستانیوں کی زبان ہے' اس میں ہماری تہذیب ہے' ثقافت ہے اور کلچر ہے' اس کی حفاظت اور بقا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

محمد خواجہ مجیب الدین

محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

زمانہ قدیم میں کبوتروں کی ڈاک

بسکہ دارد اشتیاق دیدن مطلوب ما
بال بر بال کبوتر برد مکتوب ما

ریل کی حیرت انگیز ایجاد نے جن لوگوں کو کسی خبر کے جلد حاصل کرنے کا خوگر بنا دیا ہے وہ تعجب میں ہوں گے کہ زمانہ قدیم میں جب کہ نہ تو یہ قوتیں مجتمع ہوئی تھیں اور نہ یہ ڈاک کا انتظام تھا، ضروری خبریں شہر بشہر کیسے پہنچتی ہوں گی؟ جنگ کے موقعوں میں کس طریق سے کام لیا جاتا ہوگا؟ فون کی ضرورت، اسباب رسد کی کمی، آلات حرب کی غیر موجودگی، ان سب باتوں کی جن کی فی الوقت ضرورت ہوا کرتی ہے شہر میں کیسے خبر ہوتی ہوگی؟ فتح وظفر، جن کا مدار انہیں باتوں کی موجودگی پر ہے، کسی فریق کو کیسے نصیب ہوتی ہوگی؟ ضرور ہے کہ فتح کا مدار اتفاقات پر ہوگا۔ یا جن فریق کے پاس ان چیزوں کی زیادہ کمی ہوتی ہوگی وہ ہی شکست کا دل شکن منہ دیکھتا ہوگا مگر ہم انہیں زمانہ قدیم کی تاریخوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس زمانے کی ضرورتوں کے موافق اسی قسم کے ذرائع پیدا کر دیے تھے اور ان سے اسی طرح کے کام نکلتے تھے جو آج اس زمانے کی رفتار سے تیز چلنے والی ریل سے عموماً نکلتے ہیں۔

تاریخ عالم کے دیکھنے والے اور افسانہ عالم کے سننے والے خوب جانتے ہیں کہ دنیا کے کارخانے اسی روش پر چلتے آئے ہیں۔ ایک زمانے میں اس زمانے کی ضرورتوں کے موافق کوئی چیز رفع ضرورت کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی اور آگے چل کر کسی دوسری چیز کی ایجاد اسے فضول ٹھہرا دیتی تھی۔ اور اس وقت اسی قسم کی ضرورتیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ دنیائے تاریک میں ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ بحری سفر کے لیے کوئی ذریعہ نہ تھا اور دنیا کی ضرورتیں بھی رفع ہوتی تھیں۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ اس بحری سفر کا ایک آسان ذریعہ پیدا ہوا جسے کشتی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی دنیا میں ضرورتیں پیدا ہو گئیں۔ پھر اس زمانے بعد کشتی میں اقسامی تغیرات ہوتے رہے اور اپنی اپنی ضرورتیں پیدا کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ ایک وہ زمانہ آیا کہ کشتی نے اپنی وسعت میں ترقی کی۔ اور حالت ترقی کا نام اہل دنیا نے جہاز رکھا۔ اس کے بعد یورپ نے اجتماع عناصر سے اسٹیم کا راز دریافت کر کے دخانی جہاز (اسٹیمر) جاری کیا۔ اب وہی جہاز جس کی وسعت اور تیز رفتاری پر زمانہ تعجب کرتا تھا، جس کی ایجاد نے تمام متمدن دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا، فضول خیال کیا جانے لگا اور ہر طرف ملک میں اسٹیمر کا عالمگیر رواج ہو گیا۔

اب سوچو کہ یہ کیوں ہوا؟ کس لیے ہوا؟ بس اس کا یہی جواب ہے کہ قدرت نے دنیا کے کارخانے ہی اس طریق پر رکھے ہیں اور اسی میں نظام عالم کا بڑا بھاری راز ہے۔ پچھلے

گوشۂ آزاد

زمانے میں جس حیرت ناک طریقے سے جلد خبر کے پہنچ جانے کا ذریعہ پیدا کیا گیا تھا، واقعی بات یہ ہے کہ وہ ریل سے کہیں زیادہ تعجب خیز ہے کیونکہ ریل کی ایجاد کتنی ہی حیرت انگیز کیوں نہ ہو مگر فی نفسہ ریل اس قابل نہیں ہے کہ اسے عقل تعجب کی نگاہ سے دیکھے۔ چند قوتوں کا اجتماع عجیب وغریب سرعت پیدا کرسکتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کرنے والی بات نہیں ہے۔ مگر ایک ایسی جاندار مخلوق جس میں نہ تو عقل ہو، نہ فراست ہو، نہ قوت ممیزہ ہو، ایسے ایسے کام کرے جو انسانی قواعد کے شایان ہیں، نہایت ہی تعجب خیز امر ہے! اور اس کام کے دریافت کرنے والے کی عجیب وغریب اور حیرت ناک فراست اور خداداد قوت عقلی ثابت ہوتی ہے۔

کسی ایسے زمانے میں کہ بظاہر کوئی سامان انتقال ذہنی کا نہ ہو، کسی ذہنی چیز کی ایجاد تعجب خیز ہے۔ نہ کہ ایسے زمانے میں کہ اس کے سیکڑوں اسباب موجود ہوں اور ایجادات نے اس راستے کی داغ بیل ڈال دی ہو!

جس حیوان کے ذریعے سے یہ انسانی کام لیا گیا تھا وہ ہمارے عربک لٹریچر میں انبیاء الطیور، خطماء الطیور، ملائکۃ الملوک کے مقدس ناموں سے موسوم ہے اور عام زبانوں میں اسے ''کبوتر'' کہتے ہیں۔ جس کی ظاہری صورت میں کوئی وجہ انتقال ذہنی کی نہیں پائی جاتی۔ کیا کوئی شخص ''کبوتر'' کی بھولی بھالی صورت دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ اس مساوی صورت میں اس قدر فراست کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے؟ موجود کی اس لیاقت پر عش عش کرنا چاہیے۔

پچھلے زمانے میں ان کبوتروں کی ڈاک سے شاہان وقت اور امرائے زمانہ نے اس قدر فوائد حاصل کئے ہیں کہ غالباً آج کل تمام دنیا کے کبوتروں کی تجارت میں اس قدر زمانہ منتفع نہ ہوتا ہوگا۔ تاریخ کی کتابوں میں یہ مثل اور واقعات کے تاریخی حیثیت سے لکھا جاتا ہے اور علم ادب کی کتابیں اس حیوان کی صفات سے بھری پڑی ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب وغریب کتاب حسن المحاضرہ نے اخبار مصر والقاہرہ اور علامہ ابن فضل اللہ دمشقی کی التعریف بالمصطلح الشریف رکھی ہوئی ہیں اور ہم ان کی ورق گردانی سے اپنی انتشار طبیعت کی گردش کو دور کررہے ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں کبوتروں کی ڈاک کی پوری کیفیت اور احوال نہایت ہی دلچسپ طریقے سے تحریر کئے گئے ہیں۔ ہم ناظرین کی دلچسپی کے لیے ان دونوں مستند کتابوں اور نیز بعض اور ادب کی معتبر کتابوں سے (مثل مصنفات قاضی محی الدین اور کاتب عماد وغیرہ وغیرہ کے اور بعض مغربی تصنیفات سے) کچھ ان کا حال ترجمہ کر کے ترتیب دیتے ہیں جس سے ہماری نئی روشنی کے پرستاروں کو معلوم ہوگا کہ ''ایجادات'' کا سلسلہ کچھ اس نئے زمانے ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ پچھلے زمانوں میں بھی حیرت انگیز ایجادات کا سلسلہ دیکھنے والوں کو متعجب بنا چکا ہے۔

ہم کو خوف ہے کہ کوئی صاحب ہمارے اس بیان کو شاعرانہ خیال پر محمول نہ فرمائیں کیوں کہ بلبل کے نغموں اور کبوتر کی نامہ بری کو حضرات شعرا نے بالخصوص بہت چھکایا ہے

اور ان کی دیوان اول سے آخر تک اس کے بیانات سے بھرے پڑے ہیں۔ مگر نہیں! اس وجہ سے کسی ایسے تاریخی واقعے کی صحت میں جس سے تمام مستند تاریخیں مالا مال ہوں کچھ فرق نہیں آ سکتا۔ کیا لیلیٰ مجنوں کے سچے نالوں کو ہم اس وجہ سے کہ شاعر انہیں زیادہ تر اپنی شعری ضرورتوں کے موقعوں پر پیش کیا کرتے ہیں، فرضی ٹھہرائیں گے؟ اور علم ادب عربی کی کتابیں اٹھا کر اور ان میں شاعری کی حیثیت سے خاندان برامکہ کی باتیں پڑھ کر بوجہ تعلق شعری کے ان کو غلط کہیں گے؟ **فافهموا و لاتكونوا من الغافلين۔**

اس کا موجد کون ہے؟ اس امر کا پتہ لگانا دراصل نہایت مشکل ہے کہ اس کا موجد کون ہے؟ مغربی اور مشرقی تاریخیں اس بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ ہاں اسلامی تاریخ اس امر کا ضرور پتہ دیتی ہے کہ اسلامی سلسلۂ سلطنت میں سب سے پہلے نورالدین محمود زنگی کے وقت میں اس کی ابتدا ہوئی اور گویا اسلام میں اس کی داغ بیل ڈالنے والا نورالدین ٹھہرا۔

بعض تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں شام اور مصر پر یورپ کے متواتر حملے ہو رہے تھے اور بے خبری کے سبب سے موقع پر کسی قسم کی شاہی فوج نہیں پہنچ سکتی تھی، اس وقت نورالدین محمود زنگی نے کبوتروں کی ڈاک اپنے تمام قلمرو میں قائم کی۔ اور ان کے ذریعے سے خبر رسانی کا انتظام کیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ یورپ کی دست اندازیوں سے پہلے سلطان کو خبر ہو جایا کرتی تھی اور وہ موقع پر فوج بھیج کر اس کا کافی انسداد کر دیتا تھا۔ اس طریقے کے برتنے سے تھوڑے ہی دنوں میں سلطان کی سلطنت امن و امان میں آ گئی اور ہر طرف اس کے انتظام کے ڈنکے بجنے لگے۔

لیکن اب بحث طلب یہ امر ہے کہ سلطان نے کس سن میں یہ انتظام کیا؟ جس سے یہ نتیجہ نکل سکے کہ اسلام میں کس سن سے اس ڈاک کی ابتدا ہوئی۔ مورخین کو اس میں اختلاف ہے مگر ہمارے نزدیک سب سے زیادہ مستند قول یہ ہے کہ ''یہ انتظام ۵۶۵ھ میں ہوا۔''

پس اسلام میں اس طریقہ کو رائج کرنے والا جسے اضافی حیثیت سے موجد کہنا چاہیے، 'نورالدین محمود زنگی' ہے۔ نورالدین کے بعد مشہور اسلامی فاتح صلاح الدین کے زمانے میں بھی اس سے کام لیا گیا۔ چنانچہ محاصرہ عکا کے زمانے میں بھی اہل شہر اس طریق سے لشکر تک خبریں پہنچایا کرتے تھے۔ اس زمانے کا مشہور پیراک ''عیسیٰ'' جب کچھ روپیہ یا مال و اسباب لے جایا کرتا تو رسید اہل شہر کو کبوتروں کے ذریعہ سے ارسال کر کے اطمینان دلا دیتے تھے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کبوتروں پر کس قدر اعتماد تھا۔

بغداد میں بھی خلیفہ الناصر الدین اللہ نے ادھر خاص توجہ کی تھی اور ایک محکمہ کبوتروں کی غور و پرداخت کے لئے قائم کیا تھا۔ مصر میں جس وقت اس کی قسمت کی باگ فاطمی خلفاء کے ہاتھ میں تھی، کبوتروں کی ڈاک کا بہت رواج تھا۔ ان لوگوں نے بہ نسبت اور بادشاہوں کے ادھر زیادہ توجہ کی تھی۔

گوشۂ آزاد

کبوتروں کی تعلیم اوران کی غور و پرداخت ہرایک قسم کے کبوتروں میں نامہ بری کے لئے ''موصل'' کے کبوتر سب سے اعلیٰ گنے جاتے تھےاوران کومناسیب کہتے تھے۔اور پھران کبوتروں میں خاص خاص نسل کے کبوتر عمدہ اور قیمتی گنے جاتے تھے۔ چنانچہ بغداد میں خلیفہ ناصر کے وقت میں ایک ایک موصلی عمدہ کبوتر ہزار ہزار دینار تک فروحت ہوتا تھا۔ان کے خاص خاص شجرہ نسب ہوا کرتے تھےاورنسب نامے بڑی تحقیق کے ساتھ لکھے جاتے تھے۔ان کی غور پرداخت کے لئے خاص ایک وسیع محکمہ قائم کیا گیا تھا(یہ محکمہ ۱۹۵ ہجری میں قائم کیا تھا) جن میں ان کی تعلیم کے لئے اس فن کے جاننے والے مقرر کئے جاتے تھے۔اوراس محکمہ میں اس قسم کی کتابیں تصنیف ہوئی تھیں،جن میں ان کے نسب نامےاورطریقہ تعلیم وغیرہ بطوردستورالعمل کے درج ہوں۔ چنانچہ قاضی محی الدین بن ظاہر نے ایک کتاب ان کے عادات، خصائل اورطریق پیغام رسانی پرلکھی ہے،جس کا نام تمائم الحاتم ہے۔الغرض ان کی غور پرداخت کی طرف خاص توجہ تھی اور بڑی محنتوں اور صرف کثیر کے بعدکہیں ان سے مفید کام لئے جاتے تھے۔

(۲)

اثر خامۂ مولوی ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی، مقیم کلکتہ

ڈاک کا یہ طریقہ تھا کہ تمام قلمرو میں تقریباً تیس چالیس میل کے فاصلے پران کی چوکیاں مقرر کی گئی تھیں۔ ہر چوکی میں ایک عمدہ کبوتر خانہ بنا کران میں کبوتروں کے رہنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ وہاں ایک منشی مقرر کیا گیا تھا۔ جب کسی قسم کی خبراس تک پہنچتی۔فوراًوہ ایک کاغذ پرلکھ کر کبوتر کے بازو پر باندھ دیتا تھااور کبوتر وہاں سے نہایت تیز اڑتا ہوا دوسری چوکی پر پہنچتا تھا۔ وہاں کا منشی فوراًاس کے بازو سے خط کھول کر دوسرے کبوتر کے بازو پر باندھ دیتا تھا۔ وہ وہاں سے اڑ کر تیسری چوکی پر آتا اور وہاں سے پھراسی طرح چوکی بہ چوکی ہوتے ہوئے قلیل عرصے میں خبر منزل مقصود تک پہنچ جاتی۔ اوراگر کبھی مختلف دوخبروں کے سبب سے یازیادتی خبر کے سبب سے دو کبوتروں پر تقسیم کر کے ایک ساتھ بھیجے جاتے تو ایک دوسرے کی خبر دونوں کبوتروں کے خطوں میں دے دی جاتی تھی۔اس سے مقصود یہ تھااگر جانے میں کسی وجہ سے دوسرے کبوتر کودیر ہوجائے تو اس کا انتظار کیا جائے۔

خبر لکھنے کا کاغذ:

خبر لکھنے کا خاص کاغذ ہوتا تھا۔ جواپنی ساخت میں سبک اور ہلکا ہوتا۔اس مخصوص کاغذ کا نام ''لسان الخلق'' میں ''ورق الطیر'' رکھا گیا تھا، اور اسی نام سے وہ تمام قلمرو میں مشہور تھا۔ لکھنے کا یہ طریقہ تھااور کیا اچھا طریقہ تھا کہ ابتدا میں بجائے بسم اللہ الرخ کے لکھنے کے بسم اللہ پڑھ لیا جاتا تھا۔ کیونکہ ہرحیوان کا قاعدہ ہے کہ اس پر جس قدر کم بوجھ ہوتا ہے اسی قدر وہ تیز رفتار ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے چرند پرند کہ انہیں تو بوجھ فطرتاً نہ عادی ہونے کے ذرا بوجھ بھی چلنے پھرنے میں حائل ہوتا ہے۔اس لیے لکھائی، کاغذ، سیاہی ہرایک امر میں اس امر کا خیال کیا جاتا تھا کہ اس میں زائد باتیں اور فضول رسوم کی پابندی نہ کی جائے۔ بلکہ صرف مطلب نہایت اختصار

گوشۂ آزاد

کے ساتھ لکھ دیا جائے۔ چنانچہ اسی لیے بسم اللہ نہیں لکھی جاتی تھی۔ ہاں آخر میں نیک فالی کی غرض سے حسبنا اللہ ونعم الوکیل لکھ دیتے تھے اور خط میں آس پاس حاشیہ بھی نہیں چھوڑتے تھے۔

یہ خطوط جس قدر لکھے جاتے تھے بادشاہ وقت کو لکھے جاتے تھے۔اس لیے ایشیائی طریق تحریر کے موافق ضرور تھا کہ القاب و آداب اور خوشامدانہ الفاظ ابتدا میں لکھے جاتے۔مگر نہیں! وہاں یہ طریقہ ترک کر دیا گیا تھا اور بجائے اس کے صرف ایک چھوٹا سا مگر معزز خطابیہ لفظ سے بادشاہ کو یاد کرتے تھے اور بلا کسی اور بات کے اصل مطلب شروع ہو جاتا تھا اور آخر میں صرف دن اور وقت لکھ دیا جاتا تھا۔

بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اپنے ہاتھ سے خط کھول کر پڑھتا تھا۔ خاص شاہی منزل کے اوپر نزد گاہ کبوتروں کی بنائی گئی تھی۔حکم تھا کہ جب نزول الطیر ہو اس وقت بادشاہ کو گو وہ خواب استراحت اور اکل و شرب ہی میں مشغول کیوں نہ ہو، اطلاع دی جائے۔ایک منٹ کا وقفہ نہ کیا جائے۔

چوکیوں کا فاصلہ:

کبوتروں کی چوکی کہاں سے کہاں تک تھی اور کس قدر فاصلے پر تھی؟ اس کا صحیح طور سے پتہ نہیں چلتا۔ ہاں التعریف میں لکھا ہے کہ عموماً تیس چالیس میل کا فاصلہ ہوا کرتا تھا۔ کہیں اس سے کم کہیں اس سے زیادہ۔ غالباً راہ کی صعوبتیں ان حدود کی معیار تھی۔ ۸۴۷ ہجری میں (جب کہ کبوتروں کے ڈاک کی حالت تنزل میں تھی) جہاں اور جس قدر فاصلے پر چوکیاں مقرر ہوئی تھیں ان کا ہم ایک نقشہ کتاب التعریف سے مرتب کر کے پیش کرتے ہیں۔اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ترقی کے وقت کیا کیفیت ہوگی؟

۸۴۷ ہجری میں کبوتروں کی ڈاک کی چوکیاں:

(ماخوذ از کتاب التعریف علامہ ابن فضل اللہ رحمۃ اللہ)

شمارہ	از	تا
۱	قاہرہ	اسکندریہ
۲	قاہرہ	ومیاط
۳	قاہرہ	سویز
۴	قاہرہ	بلبیس والی میں واقع ہے۔قسطاط سے تیس میل کا فاصلہ ہے۔
۵	بلبیس	الحیہ فرات اور دجلہ دو نہریں ہیں ان دونوں کے درمیان صالحیہ واقع ہے۔
۶	صالحیہ	قطیار یگستان مصر میں ایک بستی ہے۔
۷	قطیا	دارو ہشام کی حد جہاں ختم ہوئی ہے وہاں ہے۔
۸	دروہ	غزہ
۹	غزہ	بلد الخیل
۱۰	غزہ	بیت المقدس
۱۱	غزہ	نابلسیہ شہر بیت المقدس سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔
۱۲	غزہ	
۳۱	لد	قاقونیہ رملہ کے قریب ایک قلعہ کا نام ہے۔

گوشۂ آزاد

۴۱ اربل طفس

۵۱ طفس صنمین دمشق سے دو میل کے فاصلے پر ہے (اور اس نام کو ''دو'' سے کتنی رعایت۔)

۶۱ صنمین دمشق

۷۱ دمشق بعلبک، بعلبک دو جملوں سے مرکب ہے بعل اور بک سے۔ پہلا بت کا اور دوسرا بادشاہ کا نام ہے۔

۸۱ دمشق قارا قارا، وہی مقام ہے جس کا ذکر عہد جدید اور قدیم میں ہے۔

۹۱ دمشق قرتبین تدمر سے یہ بھی دو منزل کے فاصلے پر ہے (اور لطف یہ کہ یہ تنبیہ کا صیغہ ہے) آزاد

۰۲ حمینین صفل ایک پہاڑی پر یہ بستی آباد ہے (سرحد حمص پر)

۱۲ حمینین بیسان اردن کے حوالی میں ہے۔

۲۲ بیسان اذرعات شام کا ایک قصبہ ہے۔

۳۲ طفس اذرعات

۴۲ قارا حمص

۵۲ حمص حماہ

۶۲ حماہ معرہ حوالی حلب میں اس سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔

۷۲ معرہ حلب

۸۲ حلب بیرہ حوالی حلب میں ایک قلعہ کا نام ہے۔

۹۲ حلب قلعۃ المسلمین نام سے ظاہر ہے۔

۰۳ حلب بہسنی فرات کے کنارے پر قریب سمیاط کے ایک قلعہ ہے۔

۱۳ قوینتین تدمر حلب سے چار پانچ دن کا راستہ ہے۔

۲۳ تدمر سخنہ

۳۳ سخنہ قباقب لیکن چند دنوں سے یہاں ڈاک بند ہوگئی ہے۔

۴۳ قباقبر حبہ قباقب سے رحبہ اور تدمر سے قباقب تک ڈاک جاری ہے۔

کبوتروں کی غور و پرداخت اور ان کے محکمے:

ترتیب کے لحاظ سے تو ہم بہت دیر سے اس عنوان پر پہنچے ورنہ اس عنوان کا بیان سب سے پہلے ہونا تھا۔ کیونکہ جن کبوتروں کے یہ کچھ اوصاف بیان کئے جاتے ہیں ان کے متعلق ہر ایک شخص غور میں ہوگا کہ وہ کیسے ہوں گے؟ ان میں فطرتاً یہ اوصاف ہوں گے؟ یا انہیں سکھایا پڑھایا جاتا ہوگا؟ آخر اس کی صورت کیا ہوگی؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کبوتر ویسے ہی کبوتر ہوں گے جیسے کہ آج کل شیرازی کبوتر ہوا کرتے ہیں۔ یقیناً ان کی صورت بھی ایسی ہی ہوگی (دیکھو فزیالوجی) مگر شہر موصل میں ایک قسم کے کبوتر ہوتے تھے۔ جن کا نام وہاں کی اصطلاح میں 'منا سیب' ہے۔ یہ کبوتر فطرتاً بہ نسبت اور کبوتروں کے انسان سے مانوس اور چالاک ہوتے ہیں۔ انہیں سے یہ کام لیا جاتا تھا۔

ان کبوتروں کی بھی بہت سی اقسام ہیں۔ خاص خاص نسل اور خاص خاص قسموں کے کبوتر انتخاب کئے جاتے تھے۔ الناصر الدین اللہ نے بغداد میں اور فاطمی خلفاء نے مصر

گوشۂ آزاد

میں جو محکمے قائم کئے تھے ان میں اس قسم کے لوگ خاص طور سے ملازم تھے جو کبوتروں کے اقسام سے واقف اور ان کے شجرہ نسب کے حافظ تھے۔ خاص نسل کے عمدہ کبوتر ہزار ہزار دینار تک فروخت ہوتے تھے اور محکمہ انہیں بخوشی خرید کرتا تھا۔

اس قسم کی کتابیں تالیف کی گئی تھیں جن میں ان کے نسب نامے، انسانی انساب کی طرح مشجر لکھے جاتے تھے۔ اوران کے موافق ان کی غورو پرداخت کی جاتی تھی۔ اس کے بعد کبوتروں کو اڑا اڑا کر اور تعلیم یافتہ کبوتروں کے ہمراہ پھرا کر سکھایا جاتا تھا اور ان کی چالاک طبیعت فوراً سیکھ جاتی تھی۔

پچھلے زمانے میں سلاطین وقت نے اس سے بڑے بڑے فوائد حاصل کئے ہیں اور بہت سے ملکی امور میں ان سے مدد لی ہے۔ جس زمانے میں کہ نورالدین سلطان کے تمام مقبوضات پر یورپ کے حملات کا سیلاب جاری تھا اوراس کے متعلق خیال کیا گیا تھا کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ مہلک سیلاب تمام سلطنت کو بہا کر لے جائیگا، اس وقت ان ہی کبوتروں کے باعث تمام سلطنت اس سیلاب عظیم سے محفوظ ہوگئی اور بروقت مدد پہنچ جانے کے سبب سے اس کا اچھی طرح انتظام کرلیا گیا۔

بغداد کے خلیفہ الناصر الدین اللہ نے بھی (جیسا کہ تم پڑھ چکے ہو) ادھر توجہ کی تھی اور کبوتروں کی ڈاک اپنی قلمرو میں جاری کی تھی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ تمام سلطنت کے کسی واقعہ سے وہ بے خبر نہ رہتا تھا۔ اس کی بادشاہت کا رعب شام سے ہندوستان تک پہنچا ہوا تھا۔ چین تک اس کا اثر حکومت پہنچا۔ اوراسپین تک اس کے نام پر دعائیں دی گئیں۔

و هذا ایضاًمن بر کاته البرامکه!

سلطان صلاح الدین نے بھی کبوتروں سے بہت وقتوں میں مدد لی ہے اور انہیں کے ذریعے سے پیامبری کر کے کام نکالا ہے۔ (محاصرہ عکا) لڑائی کے موقعوں میں جب اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا تو کبوتروں ہی کی طرف توجہ کی جاتی ہے اورانہیں کے ذریعہ سے مخبری کا کام ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی نظیر بہت سی لڑائیوں میں ملے گی۔

عربک لٹریچر اور کبوتر:

یوں تو اردو و فارسی دونوں زبانوں کے قصیدوں میں بکثرت کبوتروں کی نامہ بری کا ذکر موجود ہے۔ مگر عربی لٹریچر جس قدر اس سے مؤثر ہوا ہے، غالبًا کوئی لٹریچر اس قدر نہ ہوا ہوگا۔ اہل ادب نے ان کی مداح سرائی کی ہے اور خاص قصیدے اور مختلف نظمیں ان کے اوصاف میں لکھی ہیں۔ عجیب وغریب ناموں سے یاد کیا ہے۔ خطماء الطیر ملائکۃ الملوک۔ ملک الطیور۔ اور کیا کیا کچھ پرلطف نام رکھے گئے ہیں۔ بعض افاضل ادب نے مقفی نثریں اور رنگین عبارتیں ان کی مدح میں لکھی ہیں۔ اوران میں کبوتروں کو سبھی کچھ بنایا ہے۔ آج کل تو نامہ بر کبوتروں کی کہیں سے آواز نہیں آتی۔ تار برقی کی حیرت ناک ایجاد نے یہ سب کچھ خواب وخیال کر دیا ہے۔ اب نہ کسی محکمے کی ضرورت ہے نہ موصل میں

گوشۂ آزاد

جا کر مناسب کے تلاش کرنے کی۔ بس دو روپیہ جیب سے نکال کر تار آفس میں جا کر دے دیجئے۔ کاغذ کے لیے ورق الطیر کی آپ کو ضرورت نہ ہوگی۔ ورق التار پر جو مفت ملا کرتا ہے خبر لکھ دیجئے۔ ہاں اختصار اسی طرح مدنظر رہے۔ ارجنٹ تار ہی دو گھنٹے میں مکتوب الیہ کو پہنچ جائے گی! لیجئے! کہاں کے کبوتر اور کیسا محکمہ!

دنیائے شاعری کو اس وقت کبوتروں کی نامہ بری موقوف ہوگئی ہے۔ مگر خیر سے ''دنیائے شاعری'' میں ابھی تک بڑے زور و شور سے جاری ہے۔ اس عجیب دنیا میں یہ حضرت کبوتر عجیب عجیب کام کرتے ہیں۔ کبھی تو عشاق کی خبریں، ان کی دردناک کیفیت معشوق تک پہنچا دیتے ہیں اور کبھی بے چارے عاشق پر توجہ نہیں کرتے، اور معشوقانہ انداز دکھلاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مژدہ وصل سے عشاق کو مسرور کر دیں مگر بہت کم۔ اس دنیا میں اس کبوتر کو قاصد اور صبا کے برابر جگہ دی جاتی ہے جو ان کے لئے باعث افتخار رہے۔ ان کی موجودگی کو عشاق اپنی قسمت کی یاوری اور ان کی عدم موجودگی کو بدنصیبی سمجھتے ہیں۔ اور حالت یاس میں کہتے ہیں کہ:

نہ قاصدے نہ صبا ہے نہ مرغ نامہ برے
کسے ز بیکسی ماتمی برد خبرے

بعض اوقات کبوتر کو بھی مشتاق دیدار سمجھتے ہیں اور ان کی اس تیز رفتاری کو اسی خود غرضی پر محمول کرتے ہیں،

بسکہ دارد اشتیاق دیدن مطلوب ما
بال بر بال کبوتر می زند مکتوب ما

کبھی کبوتر کی سرخ سرخ آنکھیں اس طور پر تسلیم کی جاتی ہیں کہ ہمارے درد و غم کو دیکھ کر آنکھوں سے خون رو رہا ہے!

سرخی چشم کبوتر ہیچ میدانی کہ چیست
نامہ می برد از من و بر حال من خون مہگیر ست

غرض دنیائے شاعری میں اس کی نامہ بری خوب جاری ہے:

احوال ما زحوصلہ نامہ بیش بود
برخے از ان بیان کبوتر نوشتہ ام
جواب نامۂ من غیر نا امیدی نیست
زدست سو دن بال کبوترم پیداست
تابرد شوق نامۂ رنگین کبوترم
گردید لال وار سپید و سیاہ و سرخ
قاصد ادا می نامہ تواند نہ عرض شوق
حیف از زبان کہ بال کبوتر نمی شود

آزاد دہلوی۔ از کلکتہ

حاشیہ:

(۱) چنانچہ قاضی فاضل نے اس قسم کے اور بہت سے نام تعریفی اور توصیفی لکھے ہیں اور علامہ فیروزی نے بھی یہ نام لکھے ہیں۔ ۲۱۔ آزاد۔

(۲) آج کل بھی جن مقامات پر تار برق نہیں ہے وہاں ان کبوتروں سے خبر رسانی کا کام لیا جاتا ہے۔

ماخذ: مولانا آزاد کے سائنسی مضامین

☆☆☆

گوشۂ آزاد

سیکولر ہندوستان کے معمار مولانا آزاد

مولانا آزاد کی شخصیت میں مولانا اور آزاد دونوں کی صفات یکجا ہیں۔ وہ ایک جید عالم دین اور مفسر قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ حریت پسند، جمہوریت کے دلدادہ، اصول پسند صحافی، شعلہ بیان مقرر، آزادی کے جہدکار، مذہبی رواداری اور سیکولرازم کے علمبردار تھے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں مذہبی رواداری اور متحدہ قومیت کے فروغ اور اسے ایک سیکولر ملک بنانے کی کوششوں میں مولانا آزاد کی فکر کا اہم کردار رہا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا کوئی مولانا یا پھر مسلمان سیکولر بھی ہوسکتا ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ سیکولرازم ہے کیا؟ یہ مذہبی رواداری ہے یا تمام مذاہب سے برابر کی دوری، یا مذہب بیزاری یا پھر دہریت۔ اردو میں سیکولرازم کا ترجمہ غیر مذہبی، لادینی اور مذہبی رواداری کے طور پر کیا گیا ہے۔ ابتداء میں یہ لفظ دنیاوی معاملات سے دینی معاملات کی علیحدگی کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے اور یہ نظریہ نشاط ثانیہ کا محرک رہا ہے۔ God Centric سے Man Centric یعنی خدا کے اطراف نہ ہوکر انسان کے اطراف گھومنے والے نظریہ کو سیکولرازم کہا گیا۔ دنیاوی معاملات کے لئے بادشاہ اور دینی معاملات کے لئے پوپ کو محدود کرنا اس نظریہ کا ایک اور عملی پہلو تھا۔ نتیجتاً انسان کے تخیل پر لگے تمام تالے ٹوٹ گئے اور ایک جدید دنیا نشاط ثانیہ کے بعد وجود میں آئی۔

جب یہ نظریہ انگریزوں کے ساتھ ہندوستان آیا تو اس نے ایک الگ ہی صورت اختیار کرلی۔ یہاں اسے مذہبی رواداری کے معنی میں لیا گیا۔ یہ ملک دنیا کے تمام بڑے مذاہب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ مذہب اس کی روح تھی۔ مذہب سے آزادی یا بغاوت اس کا مزاج نہیں تھا۔ البتہ ان مذاہب کے پیرو ایک دوسرے کی مسابقت میں اکثر آپس میں بھڑ جاتے تھے، جس سے ملک کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی متاثر ہوتی رہی۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ کبھی ہندو اور بدھ مذہب کے ماننے والے، کبھی ہندوؤں کے ہی اندر شیو اور وشنو کے ماننے والے اور پھر مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندو اور مسلمان ایک ساتھ زندگی گزارتے ہوئے بھی اپنے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوجاتے تھے۔

انگریزوں نے ان بین مذہبی اختلافات کو اپنے تسلط کا آلہ بنالیا اور دو سو سال تک حکومت کرتے رہے۔ جدوجہد آزادی کی سب سے بڑی چنوتی ہندو مسلم اتحاد تھی، جہاں مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا دو قومی نظریہ کو لے کر آگے

گوشۂ آزاد

بڑھ رہے تھے وہیں گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس متحدہ قومیت پر کاربند تھی۔ گویا ہندوستان میں ایک ہی وقت دو جنگیں ہورہی تھیں۔ ایک تو انگریزوں کی غلامی سے آزادی کے لئے اور دوسری متحدہ قومیت کے لئے۔ اس دوسری جنگ کے اہم سپہ سالار تھے مولانا آزاد۔ حالانکہ کانگریس کے دیگر قائدین جیسے جواہر لال نہرو بھی متحدہ قومیت کے حامی تھے مگر ان کے لئے یہ اتنا اہم نہیں تھا جتنا ملک کی آزادی۔

مولانا آزاد کے لئے یہ دوسری جنگ بہت اہم تھی۔ ان کے مطابق متحدہ قومیت ہی میں ملک اور مسلمانوں کا مستقبل محفوظ ہے۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیت اور طاقت اس نظریے کی آبیاری میں لگادی اور اسلام کو قوم پرستی کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ مولانا آزاد کے مطابق ہندو مسلم اتحاد کے بغیر آزادی ایک سراب ہے۔ متحدہ قومیت کی حمایت میں مولانا آزاد کہتے ہیں:

''گیارہ سو سال کی مشترکہ تاریخ نے ہندوستان کو ہماری مشترکہ حصولیابیوں سے مالا مال کیا ہے۔ ہماری زبان، ہماری روایات، ہماری روزمرہ زندگی کے ان گنت واقعات، ہماری تمام چیزیں ہماری مشترکہ کوشش کا ثبوت پیش کررہی ہیں۔ درحقیقت ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس کی توثیق نہ کررہا ہو۔ یہ مشترکہ دولت ہماری مشترکہ قومیت کی وراثت ہے اور ہم اسے چھوڑنا نہیں چاہتے اور اس ماضی کی طرف واپس نہیں جانا چاہتے جب ہماری مشترکہ زندگی شروع ہی نہیں ہوئی تھی''۔

ہندو مسلم اتحاد کی پرزور وکالت کرتے ہوئے مولانا آزاد کہتے ہیں کہ ''اگر سارے انسان ہمارے بھائی ہیں تو اس مٹی کے بیٹے ہم سے زیادہ احترام پانے کے مستحق ہیں۔ وہ وہی پانی پیتے ہیں جو ہم پیتے ہیں اور اس کے ماحول سے ویسے ہی پیار کرتے ہیں جیسے کہ ہم کرتے ہیں''۔

ہندو مسلم اتحاد کے حق میں ان کے ان الفاظ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنی اسلامی شناخت سے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں یا پھر اس کی انفرادیت کو ختم کرکے مشترکہ قومیت کے نام پر ایک نیا طریقہ اپنانا چاہتے ہیں۔ دراصل مولانا آزاد قوم پرستی اور اسلام کو ایک دوسرے کا مخالف نہیں مانتے تھے اور ان دونوں میں مفاہمت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ 1940ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے رام گڑھ اجلاس کے اپنے خطاب میں مولانا آزاد اپنا موقف واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''میں ایک مسلمان ہوں اور میں اپنے مسلمان ہونے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ مجھے تیرہ سو سال کی متمول روایات ورثے میں ملی ہیں۔ میں اس کا چھوٹا سے چھوٹا حصہ بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اسلامی تعلیمات، اسلامی تاریخ، اسلامی علوم وفنون، اسلامی شناخت یہ بھی میرے لئے قیمتی خزانہ ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں مذہبی امور میں اپنی خود کی انفرادیت رکھتا ہوں اور ان میں کسی کی بھی مداخلت برداشت

نہیں کروں گا۔لیکن ان سارے جذبات کے ساتھ میں اور جذبہ رکھتا ہوں جو میری خود کی زندگی کی حقیقت کی پیداوار ہے۔اس کی راہ میں اسلامی روح حائل نہیں ہوگی۔ یہ اس جذبے کے لئے میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتا ہوں۔ میں اس ناقابل تقسیم متحدہ قوم پرستی کا جزولاینفک ہوں جس کے بغیر ہندوستان کی عظمت کی ساخت ادھوری رہے گی۔ میں اس کی ساخت میں ایک ناگزیر عنصر ہوں۔ میں کبھی بھی اس دعوے سے دستبردار نہیں ہوں گا''۔

مولانا آزاد کا ماننا تھا کہ ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک ساتھ زندگی گزارتے ہوئے ایک سانچے میں ڈھل گئے ہیں اور یہ گنگا جمنی تہذیب کے ایک ناقابل تقسیم متحدہ ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ آزاد کا یہ خیال کہ' ہندو اور مسلمان اپنی الگ مذہبی شناخت کے باوجود اپنی معاشی معاشرتی اور تمدنی ضرورتوں کو ایک سیاسی نظام کے تحت حاصل کر سکتے ہیں'، ہندوستان میں سیکولرازم کی بنیاد ہے یعنی مذہب کسی فرد یا گروہ کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔

مولانا آزاد نہ صرف اپنی تحریروں اور تقاریر کے ذریعہ متحدہ قومیت کے لئے لوگوں کی ذہن سازی کرتے رہے بلکہ عملی طور پر بھی ہندوستان کو متحدہ رکھنے کے لئے ان تھک کوشش کرتے رہے۔ ہندوستان کی آزادی کے نتیجہ خیز دور میں ایک لمبے عرصے تک یعنی 1940 سے 1946 تک وہ کانگریس کے صدر رہے۔ اس دوران مولانا آزاد نے متحدہ قومیت کے نظریے کو منوانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ان کے لئے یہ ایک بڑی چنوتی تھی کیونکہ اس نظریہ کی کامیابی پر مولانا آزاد کو جتنا یقین تھا کسی اور کو نہیں تھا۔ انگریزوں کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ہندوستان ایک رہے یا دو۔ نہرو، پٹیل اور دیگر کانگریسی قائدین اندیشوں کا شکار تھے اور دونوں میں کسی بھی صورت کو قبول کرنے کے لئے تیار تھے۔ جبکہ ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ اس کی شدید مخالفت کر رہے تھے اور اسے ایک ناقابل عمل نظریہ ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ مولانا آزاد نے مذہب کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کو روکنے کے لئے آخر لمحے تک کوشش کی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کانگریس بھی تقسیم کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوگئی ہے تو سردار پٹیل کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا:

''اگر ہم نے بٹوارہ قبول کیا تو یہ ہندوستان کے لئے ایک مستقل مسئلہ بن جائے گا۔ بٹوارہ مسئلہ حل نہیں کرے گا بلکہ ملک کا ایک مستقل مسئلہ بن جائے گا۔ جناح نے دو قوموں کے نعرہ کو بلند کیا تھا۔ بٹوارے کو تسلیم کرنے کا مطلب اس نعرے کو تسلیم کرنا تھا۔ کانگریس بھلا ملک کو ہندو اور مسلمان کی بنیاد پر تقسیم کرنے سے اتفاق کر سکتی تھی؟ تقسیم، فرقہ وارانہ خوف کو روکنے کے بجائے فرقہ وارانہ منافرت کی بنیاد پر دو مملکتوں کا قیام کر کے اسے دوام بخشے گی۔ ایک بار منافرت کی بنیاد پر مملکتیں معرض وجود میں آگئی تو کوئی نہیں جانتا کہ صورت حال

گوشۂ آزاد

کیا رخ اختیار کرے گی۔‘‘

ملک کی تقسیم کے فیصلہ کے بعد بھی مولانا آزاد اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ مذہب کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ اپریل 1946ء میں مسلمانوں کے نام اپنے ایک بیان میں انہوں نے اپنے اندیشوں کو اس طرح ظاہر کیا:

’’اب ہندوستان کی تقسیم ایک حقیقت بن گئی ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی میرے حلق سے نہیں اترتا۔ میں نے قطعی رائے ظاہر کی ہے اور اب بھی کہوں گا کہ میں نے پاکستان کی اسکیم پر ہر پہلو سے غور کیا ہے اور خاص طور پر اس پر بھی کہ اس کا اثر مسلمانوں پر کیا پڑے گا۔ یہ مسلمانوں کے لئے سخت نقصان دہ مسائل کھڑے کردے گی اور پاک اور ناپاک علاقوں کی یہ تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے۔ یا پھر اسلام سے انحراف ہے۔ اسلام ایسی کسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا‘‘۔

مولانا آزاد کی ان تمام کوششوں کا کوئی مثبت اثر نہیں ہوا۔ اتحاد کی بات کرنے والے اکیلے رہ گئے اور تفریق کی تحریک چلانے والے کامیاب ہوگئے۔ نفرت نے محبت پر، جنون نے ہوشمندی پر فتح پائی اور ملک ہندوستان اور پاکستان میں بٹ گیا۔

مولانا آزاد ہندوستان کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم ہونے سے تو روک نہیں سکے مگر دو قومی نظریے کے خلاف ان کا مضبوط موقف اور متحدہ قومیت میں ان کے اٹوٹ یقین نے ہندوستان کو ایک ہندو راشٹر بننے سے بچالیا۔ مولانا آزاد نے پاکستان پر اپنے مادرِ وطن کو ترجیح دے کر نہ صرف دو قومی نظریہ کو عملی طور پر ٹھکرایا بلکہ ہندوستان کو سیکولر ملک بننے کا جواز فراہم کیا۔ اگر اس نازک موڑ پر مولانا آزاد جیسی شخصیت نہ ہوتی تو ہندو راشٹر بنانے کی فرقہ پرستوں کی مانگ کو مسترد کرنا کانگریس کے لئے مشکل ہوجاتا۔ مایوسی کا شکار فرقہ پرست طاقتوں نے گاندھی جی کا قتل کردیا۔ گاندھی جی کی شہادت پر ملک بھر میں فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف نفرت کی لہر چل پڑی اور یہ طاقتیں شکست خوردہ ہوگئیں۔

اس طرح مولانا آزاد نے متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی بے مثال کوششوں سے اور مہاتما گاندھی نے اپنی شہادت کے ذریعے اس ملک کو ہندو راشٹر ہونے سے بچالیا اور یہ ایک سیکولر ملک بنا۔ افسوس اب ملک میں نہ مہاتما گاندھی ہیں اور نہ مولانا آزاد۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید نجی اللہ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ نظم ونسق عامہ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
گچی باولی، حیدرآباد۔032 500
موبائل نمبر:9705704939

گوشۂ آزاد

عصر حاضر میں مولانا آزاد کی تعلیمی فکر اور اس کی افادیت

''ایک چیز آپ بھول گئے۔ وہ چیز ہے تعلیم اور وقت اور زندگی کی چال کے غیر متعلق کوئی تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اگر وہ وقت اور زندگی کی چال کے ساتھ نہ ہو۔ جو تعلیم ہو وہ ایسی ہونی چاہئے کہ زمانہ کی جو چال ہے، اس کے ساتھ جڑ سکتی ہے۔ اگر آپ دونوں ٹکڑوں کو الگ رکھیں گے تو وہ تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔'' (مولانا آزاد)

مولانا ابوالکلام آزاد ایک جید عالم' ایک عظیم مجاہد' ایک صاحب انشاء پرداز' ایک بلند پایہ صحافی' ایک اہم ادیب' ایک دوراندیش مفکر اور زمانہ شناس قائد تھے۔ مولانا آزاد ایک عظیم تعلیمی رہنما تھے۔ وہ طلبہ کو دینی کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کے بھی قائل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ طلبہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بھی آگے بڑھیں کیونکہ اس کے بغیر کوئی بھی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ انہوں نے ایک ایسے تعلیمی نظام کی وکالت کی تھی جو سائنس اور بھاری صنعتوں کے شایان شان ہو۔ مولانا آزاد مسلمانوں کے دائیں ہاتھ میں قرآن اور بائیں ہاتھ میں سائنس وٹکنالوجی کی بات کہتے تھے۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی سوچ وفکر کو آپ ان کے تعلیم کے تئیں نظریات سے کرسکتے ہیں۔ مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات کی بنیاد 4 امور پر استوار ہے۔ ایک ذہنی بیداری، دوسرے اتحاد وترقی، تیسرے مذہبی رواداری اور چوتھے عالمی اخوت۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خیال میں آزاد ہندوستان میں تعلیم کا سب سے اہم مقصد نئی نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنا ہونا چاہئے کیونکہ انگریزوں کے طریقہ تعلیم نے نوجوان نسل کے لئے دو زہریلے نظریات پیدا کردیئے تھے' ایک غلامی دوسرے علاحدگی پسندی۔ انگریزوں کے تعلیمی نظام کا مقصد حکومت کے لئے ایسے کارندے پیدا کرنا تھا جو ان کے کام آئیں۔ مولانا آزاد مسلمانوں کو احساس کم تری سے نکال کر بلندی سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔ وہ اجتماع مذہب وسیاست کے پرزور وکیل تھے۔

وزیر تعلیم بنتے ہی مولانا ابوالکلام آزاد نے انسان کی زندگی کی سب سے اہم ضرورت تعلیم کے لئے مخصوص بجٹ کے ایک فیصد کو بڑھا کر دس فیصد کرنے کی تجویز رکھی کیونکہ وہ تعلیم کی اہمیت کو جانتے تھے۔ تعلیم کے بارے میں پانچ پروگرام پیش کئے۔ (۱) اسکول جانے والے تمام بچوں کے لئے بیسک ایجوکیشن کی فراہمی (۲) ناخواندہ بالغوں کیلئے سماجی تعلیم (۳) سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کے معیار کو اونچا کرنے کے لئے سہولتوں کی فراہمی (۴) قومی ضروریات کے حصول کیلئے فنی اور سائنسی تعلیم (۵) فنون لطیفہ کے فروغ اور دیگر تفریحات کی فراہمی کیلئے ثقافتی سرگرمیوں میں اضافہ۔

مولانا آزاد ملک کی ترقی میں سائنس کا کردار اہم سمجھتے تھے اور سائنسی علم کے ذریعہ سماج کی ترقی کی راہیں ہموار کرنے پر زور دیتے تھے۔ مولانا آزاد جب 1956ء

گوشۂ آزاد

میں یونیسکو کے صدر منتخب ہوئے تو انہوں ہندوستانی تعلیمی نظام کو سنوارنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا اگرچہ اردو، فارسی، اور عربی کے عالم تھے، تاہم انگریزی تعلیم کو بھی یکساں اہمیت دیتے تھے اور ملک اور قوم کی ترقی میں انگریزی علوم کے حصول کو لازمی قرار دیتے تھے۔

وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کی 11 سالہ خدمات سنہرے لفظوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انہوں نے آزاد ہندوستان میں تعلیم کی ایک ایسی مضبوط بنیاد ڈالی جس سے آج بھی ہماری قوم فائدہ اٹھا رہی ہے۔ انہوں نے یونیورسٹیوں، تکنیکی اداروں اور صنعتوں میں باہمی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ جانتے تھے کہ بغیر تکنیکی تعلیم کے ملک ترقی نہیں کرسکتا۔ آج ہندوستان تکنیکی طور پر دنیا بھر میں جو اعلیٰ مقام رکھتا ہے اس کے بانی مولانا ابوالکلام آزاد ہے۔ انہوں نے کھڑک پور میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کا قیام عمل میں لایا۔ جس کی وجہ سے آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ سارے ہندوستان میں ٹکنیکل اداروں کا جال بچھ گیا ہے اور ہندوستان ٹکنالوجی میں تیزی سے ترقی کررہا ہے۔ مولانا آزاد فنون لطیفہ میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ مولانا آزاد کی نظر میں شخصیت کی تعمیر میں مصوری، موسیقی، رقاصی، سنگ تراشی، ڈرامہ سب ہی فنون اہم تھے۔ اور اسی کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے ساہتیہ اکیڈیمی کا قیام عمل میں لایا۔ آج ساری دنیا سائنس کو اہمیت دے رہی ہے۔ مولانا آزاد نے دیگر زبانوں میں موجود سائنسی علوم کو ہندی زبان میں منتقل کیا اور سائنس سے متعلق تکنیکی لغات کے کام کا آغاز کیا۔ مولانا آزاد کے دور میں ہی امپریل لائبریری کی جگہ نیشنل لائبریری کا قیام عمل میں لایا گیا۔

اعلیٰ تعلیم کے میدان میں مولانا آزاد نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ طلبہ کی اہلیت وقابلیت کی سطح کو بلند کیا جائے۔ ثانوی تعلیم کے تئیں ان کا نظریہ تھا کہ یہ تکمیل علم کی ایک ایسی منزل قرار پائے جسے طئے کرنے کے بعد زیادہ طلبہ عملی زندگی میں قدم رکھ سکے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہر شہری کی تعلیم کے حق میں تھے اور اسے پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ کئی سال بعد ان کے ان اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے پارلیمنٹ نے حق تعلیم ایکٹ کو منظور کیا۔ مولانا آزاد کی تعلیمی پالیسی نے ملک میں ناخواندگی کو دور کرنے میں اہم مدد دی۔ آج ہندوستان ان کی اس منصوبوں کی وجہ سے تعلیم کے میدان میں ترقی کررہا ہے۔ آج ہمارا ملک ایشیاء میں جاپان اور چین کے بعد سائنسی تعلیم میں سب سے آگے ہے۔

مولانا آزاد مادری زبان میں تعلیم کے حق میں تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''بچے کو اس کی زبان میں علم دینا ایسا ہے کہ بادام کا چھلکا اتار کر اسے کھلانا اور دوسری زبان میں تعلیم دینا ایسا ہے کہ چھلکے سمیت کھلانا جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اور بقول لارڈ میکالے غلام پیدا ہوں گے۔''

مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو نے ایک دوسرے کے تعاون اور ایک دوسرے کے مشورہ سے نئے ہندوستان کا

گوشۂ آزاد

خاکہ بنایا اور اس کے مستقبل کی تعمیر کا منصوبہ مکمل کیا۔ داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کی تشکیل کا ہر مشکل اور پریشان کن مرحلہ میں وہ ایک دوسرے کی دستگیری کرتے اور ایک دوسرے کو تسلی دیتے۔ بحیثیت وزیر تعلیم انہوں نے ہندوستان کی تہذیبی اور تعلیمی پالیسی بنیاد رکھی۔ مولانا آزاد تعلیم سے متعلق اپنے فرائض کی انجام دہی میں کسی حد تک کوشاں تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے انہوں نے 1948ء میں بڑی اہمیت کے ساتھ کہی تھی کہ:

''مرکزی بجٹ کا کم از کم دس فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کیا جانا لازمی ہے''

جو آج تک آزاد ہندوستان کے لئے ایک خواب ہی ہے انہوں نے وزارت تعلیم کے 11 سالہ عرصہ میں منظم انداز میں اعلیٰ تعلیمی سوسائٹیوں ' اداروں اور تنظیموں کی تشکیل کی۔

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے اصرار وخواہش پر وہ وزارت ہند میں شامل ہوئے اور مہاتما گاندھی کے مشورہ پر انہوں نے وزیر تعلیم کا اہم اور سب سے ذمہ داری والا قلمدان سنبھالا۔ اس کے ساتھ ساتھ بعد میں ان کی قابلیت اور کوششوں کو دیکھتے ہوئے سائنس اور کلچرل کی بھی ذمہ داری انہیں سونپی گئی۔ آزاد ہندوستان کے بعد 1957 میں دوسرے انتخابات کے بعد انہوں نے دوبارہ تعلیم اور سائنسی تحقیقات کی وزارت کا قلمدان سنبھالا۔ اور اسی وزارت پر خدمت کرتے ہوئے وہ 22 فروری 1958 کو 69 سال کی عمر میں علم کا وہ عظیم چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا جس نے اپنی علم کی روشنی اس قدر پھیلادی کہ آج بھی ہندوستان کے نوجوان اس سے فیضیاب ہورہے ہیں۔

مولانا آزاد عورتوں کی تعلیم کے حق میں تھے۔ وہ ہمیشہ چاہتے تھے کہ عورتیں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ لڑکیوں کو علم کے زیور سے دور نہیں رکھنا چاہئے کیونکہ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوں گی تو سماج میں تبدیلی لاسکتی ہیں۔ اگر باہر کی دنیا سے واقف ہوں گی تو اچھائی اور برائی میں فرق کریں گی ورنہ ایک گھر میں بند وہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔

مولانا آزاد نے ان اداروں ' آرگنائزیشن ' کمیشنس ' کونسل ' بورڈس ' بیوروس وغیرہ کا قیام عمل میں لایا۔

☆ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (1948) جس کے تحت ہندوستان میں آج سارا تعلیمی نظام چل رہا ہے اور طلبہ کو اعلیٰ تعلیم جیسے ریسرچ میں خطیر رقم اسکالرشپ کے ذریعہ فراہم کی جاتی ہے تاکہ وہ صرف پڑھائی پر دھیان دے سکے اور مضبوطی کے ساتھ علم کے میدان میں آگے بڑھتے ہوئے ملک وقوم کا نام روشن کرے اور غریبی ان کے اعلیٰ تعلیم کے خواب کو نہ توڑ سکے۔

☆ آل انڈیا کونسل فار سکینڈکری ایجوکیشن جس کا مقصد ریاستوں میں تعلیمی نظام میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔

☆ سکینڈری ایجوکیشن کا قیام 1952 میں عمل میں آیا۔ مولانا کا ماننا تھا کہ پرانی تعلیمی نصاب ہائی اسکول کا بدلنا چاہئے اور اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہئے۔ جس کے تحت

گوشۂ آزاد

ڈاکٹر اے ایل مودالائیر کے زیر نگرانی ایک کمیشن کا قیام عمل میں آیا اوران کمیشن کے سفارشات کے تحت سکینڈری ایجوکیشن کی ساخت میں تبدیلی لائی گئی۔

☆ آل انڈیا کونسل فار ٹکنیکل ایجوکیشن جس کے تحت کئی ٹکنیکل اسکولس اور کالجس کھولے گئے۔

☆تعلیم بالغاں (Adult Education) بورڈ کے قیام کا مقصد ناخواند بالغ افراد کے لئے تعلیم کا انتظام کرنا۔

☆ دیہی عوام تک تعلیم کے ثمرات پہنچانے کے مقصد سے رورل ہائیرایجوکیشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔

☆سنٹرل سوشل ڈیولپمنٹ بورڈ

☆سنٹرل ایجوکیشن بورڈ

☆ایجوکیشنل اینڈ ووکیشنل گائیڈنس بیورو

☆نیشنل آرگنائزیشن فار بیسک ایجوکیشن

☆کونسل فار سائنٹیفک اینڈ ٹکنیکل ریسرچ

ان تمام اہم کارناموں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد نے قومی زبان ہندی کی ترقی اوراہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کے لئے کئی پروگرامس کا اہتمام کیا۔انہوں نے فزیکل ایجوکیشن جسمانی تعلیم اور نوجوانوں کے بہتر مستقبل، سماجی کاموں، معذورین کے لئے تعلیم وغیرہ وغیرہ کے لئے بہت کام کیا۔ اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ ہندوستان کے تمام اہم تعلیمی کاموں کی بنیاد اوران کی ترقی کے لئے اقدامات مولانا آزاد کے وزارت تعلیم کے دور میں کئے گئے۔

ساتھ ہی ساتھ ساہتیہ اکیڈیمی، آرٹ اکیڈیمی اور ڈانس ڈرامہ جیسی تین اہم کلچرل اکیڈیمیوں کا قیام بھی مولانا آزاد نے وزارت تعلیم کے تحت کیا۔

آج ہندوستان کی حکومت ان کے ان کارناموں کوخراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے یوم پیدائش 11 نومبر کو یوم تعلیم کے طور پر 2008 سے منارہی ہے۔مولانا آزاد کو بعداز مرگ 1992ء میں ہندوستان کے سب سے بڑے شہری اعزاز بھارت رتن سے نوازا گیا۔ میں اپنی تحریر کا اختتام آغا شورش کشمیری کی جانب سے مولانا آزاد پر لکھی گئی شہرہ آفاق نظم پر کرتا ہوں۔

کئی دماغوں کا ایک انساں، میں سوچتا ہوں کہاں گیا ہے؟
قلم کی عظمت اجڑ گئی ہے، زباں کا زور بیاں گیا ہے
اتر گئے منزلوں کے چہرے، امیر کیا؟ کارواں گیا ہے
مگر تری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے!
یہ کون اٹھا کہ دیر وکعبہ شکستہ دل، خستہ گام پہنچے
جھکا کے اپنے دلوں کے پرچم، خواص پہنچے، عوام پہنچے
تری لحد پہ خدا کی رحمت، تری لحد کو سلام پہنچے
مگر تری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے!

☆☆☆

محسن خان
مکان نمبر: 19-3-294/264/96/A، محبوب کالونی،
نزد متین کرانہ اسٹور،وٹے پلی، حیدرآباد۔ 500 053
موبائل:9397994441

گوشۂ آزاد

فکر آزاد آج کی اشد ضرورت

یوں تو دنیا میں روز لاکھوں لوگوں کی پیدائش ہوتی ہے اور بہت سے اپنی عمر تمام کر کے ہمیشہ کے لئے دنیا کو الوداع کہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے افراد ہوتے ہیں کہ صرف اپنا کام ختم کر کے دنیا کو خیر آباد کہہ دیتے ہیں اور دنیا میں کوئی ان کا نام لیوا تک نہیں ہوتا مگر انہی گزرنے والی شخصیتوں میں کچھ ایسی بھی ہستیاں ہوتی ہیں جو کہ دنیا کو تو چھوڑ جاتی ہیں لیکن ہمیشہ لوگوں کے دلوں پر اپنے عظیم کارنامے کی وجہ سے نام وسکہ بٹھائے رہتی ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی میدان کا شہسوار ہو اپنی قابلیت وصلاحیت، تقریر وخطابت، قیادت ونقابت، سیادت و نظامت، شستہ بیانی، سنجیدگی وعمدگی اور سیاسی وسماجی زندگی سے ہر ایک کے دل کو موہ لیتی ہیں اور بلاتفریق رفیق ورقیب سے اپنے نام کو یاد کراتی اور تذکرہ کرواتی ہے۔ انہی گزرنے والی عظیم شخصیتوں میں ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم، زور بیان و زور آور خطیب ومقرر، عظیم سیاستداں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بھی ہے۔ خود مولانا ابوالکلام آزاد اپنی پیدائش اور نام کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''یہ غریب الدیار عہد ووفا آشنائے عصر و بے گانۂ خویش ونمک پروردۂ ریش معمورۂ تمنابہ حسرت کہ موسوم بہ احمد ومدعو بابی الکلام ہے 1888ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا، اور تہمت حیات سے متہم''۔ (تذکرہ مرتبہ مالک رام بحوالہ یادگار آزاد، ص ۱۳)

مولانا ابوالکلام آزاد کے بچپن کی پوری دنیا چاہے وہ تعلیم ہو یا کھیل کود اور سیر وتفریح خود کا مکان اور والد کا حلقۂ تربیت تھی۔ گھر پر فلسفہ، اقلیدس، ریاضی اور الجبرا اور دیگر مضامین کے لئے الگ الگ معلمین کا انتظام کیا گیا تھا۔ انہوں نے بہت جلد ان مضامین پر مہارت بھی حاصل کر لی تھی۔ ابتدائی عمر میں ہی انہیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ انہوں نے تیرہ چودہ سال کی عمر میں اسلامی علوم اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ عربی، فارسی اور ترکی ادب کے مطالعہ کے علاوہ علم کیمیا اور فلکیات، علم منطق اور طب کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ 1903ء میں درس نظامی کی تکمیل بھی کی جبکہ ان کی عمر صرف پندرہ سال تھی واضح ہو کہ لوگوں کو درس نظامی کورس کی تکمیل کے لئے تیرہ چودہ سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ کارنامہ صرف چار سال میں ہی کر دکھایا تھا۔ انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان بھی سیکھی تھی۔ آزاد مقاصد حسنہ کے حصول اور اپنے عزم مصمم سے لوگوں کو باخبر کر کے اپنا ہمنوا وہم خیال بنانے کے لئے ''الہلال اور البلاغ'' جیسا اصلاح پسند اور نظریہ ساز رسالہ جاری کیا تھا جو ان کی علمی، فکری وفنی اور صحافتی خدمات کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں نظر بند اور جیل کی چہار دیواروں میں محصور کر دیئے گئے اور انہیں طرح طرح کے مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا

گوشۂ آزاد

پڑا تھا مگر انہوں نے کبھی بھی شکست وہار تسلیم نہیں کی اور ''قوت مرداں مدد ے خدا'' کے مصداق جہد مسلسل اور محنت وکوشش کرتے رہے اور اپنے کو وطن عزیز کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے اور اذیت و مشقت اٹھانے میں خوشی و شادمانی محسوس کرتے رہے۔ یہ بات بغیر کسی مبالغہ کے کہی جاسکتی ہے کہ آزاد کی زندگی کا ہر حصہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لئے کسی شجر مثمرہ سے کم نہیں جو ہمارے لئے آئیڈیل اور باعث فخر و انبساط اور لائق تقلید بھی ہیں۔ خطیب الہند کی زندگی کے ہر ہر گوشے اور ان کی خدمتوں اور محنتوں اور ان کے عظیم کارناموں سے ہر ہندوستانی اور محب وطن کو باخبر ہونا چاہئے اور حتی الامکان ان کے نقش قدم پر چل کر اس ملک عظیم و قدیم کے لئے اپنی خدمات پیش کرسکے تاکہ وطن میں حب الوطنی ،دیش بھگتی اور ترقی و خوشحالی کے شجر ہمیشہ سرسبز وشاداب اور پھل دار رہیں۔ ملک کی موجودہ صورتحال کو اس طرح بتانے کی سعی کرسکتے ہیں (۱) تعصب وتنگ نظری (۲) فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا فقدان (۳) تعلیم میں اخلاقیات کا نہ ہونا (۴) مساوی حقوق دینے سے گریز (۵) اپنے اقدار سے بے تعلقی (۶) انسان دوستی اور رواداری کا فقدان (۷) نکسلزم (۸) بے روزگاری و معاشی حالات (۹) بڑھتے کرپشن (۱۰) اشیاء کی قیمتوں میں بے تحاشہ اضافہ اور دہشت گردی کا چیلنج وغیرہم بالخصوص سب کے لئے تعلیم کی سہولت کا عملی فقدان یہ سب ایسے حالات ہیں جن سے بچ نکلنے کا واحد راستہ تعلیم ہے! اگر تعلیم پر مکمل دھیان دیا جائے اور اس کو خوب خوب کو فروغ دیا جائے تو یقینی عظیم انقلاب لایا جاسکتا ہے اور ہندوستان کو بھی ترقی یافتہ ممالک میں شمار کرایا جاسکتا ہے اور اسی کی طرف ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم نے زور بھی دیا ہے، علامہ اقبال نے کہا تھا:

قوت فکر وعمل پہلے فنا ہوتی ہے
پھر کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے

مولانا آزاد وزیر تعلیم بننے کے بعد فکری اور عملی طور پر وزارت کے کاز کو بہتر طریقے سے انجام دینے اور کچھ نیا کرنے کی سعی کی تھی۔ ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم نے اپنی ذمہ داریاں کس خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیں اسے شمیم حنفی صاحب نے یوں بیان کیا ہے:

''ملک کے پہلے وزیر تعلیم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ ہی سب سے بڑا اور دوررس کام یہ کیا کہ ہندوستان کی مشترکہ ثقافت کو فروغ دینے کی غرض سے تین اکادمیوں کی بنیاد ڈالی ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی، للت کلا اکادمی، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز یہ تمام سرسبز کھیتیاں اور ان کے بیج مولانا کے شعور کی سرزمین پر پھوٹے ہیں۔ مولانا آزاد نے آزاد ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایک ہمہ جہت، وسیع المشرب روشن وترقی پسند اور منظم ہندوستان کا خواب دیکھا تھا۔ ایک سیکولر اور روادارانہ تعلیمی نظام کے قیام سے، ان کا مقصد یہی تھا کہ ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر

گوشۂ آزاد

ممکن ہو سکے جو فرقہ پرستی اور ظلمت پسندی کے سائے سے یکسر محفوظ ہو، جو اقوام عالم میں عزت کی نظر سے دیکھا جائے اور جو ایک صحت مند ماضی کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند مستقبل کا ترجمان بھی ہو۔ ماضی کے مریضانہ تصور نے ہماری ثقافت اور سیاست کو بھی صدمے پہونچائے ہیں۔ بقول آندرے ''ہر شئے پست ہو جاتی ہے جب سیاست اسے اپنے ہاتھ میں لیتی ہے''۔ ظاہر ہے کہ تعلیم، تہذیب، ثقافت اور علمی وفکری روایتیں بھی سیاست کا کھیل بن جائیں تو اپنے بنیادی مقاصد سے دور ہو جاتی ہیں۔ مولانا نے ماضی میں ہمیں اسی رمز کی خبر دی تھی اور ہمارے قومی مستقبل کے لئے بھی یہی ان کا سندیسہ ہے''۔ (مولانا آزاد، ایک ہمہ جہت شخصیت)

مولانا آزاد نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ کھدر یعنی کھادی کپڑا ہی زیب تن کیا جائے اور غیر ملکی لباس کو اپنے تن سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا جائے۔ اس طرح یہ کپڑا ملبوس کر کے مسلمان مرد وعورت محبّ وطن کہلانے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی معاشی ترقی میں بھی خود بخود شامل ہو جائیں گے۔ آزاد ابتداء سے ہی اصلاح پسندی کے حامی تھے وہ ظاہری اصلاح کے ساتھ باطنی اصلاح میں بھی پیش پیش تھے۔ وہ دنیاوی امور کی شفافیت، انسانی خدمت اور اقتصادی ومعاشی اور سیاسی ترقی کے بھی خواہاں تھے۔ یہی وہ عظیم خوبی ہے جو اک ماہر تعلیم اور معلم میں ہوتی ہیں۔ مولانا صرف مفکر ہی نہیں بلکہ اپنے دانشورانہ تعلیمی تصورات کو عملی حیثیت دے کر قوم کی فلاح وبہبود بھی چاہتے تھے۔ وہ تعلیمی وسماجی صورت حال کو بغور ملاحظہ کر کے اس طرح کی رائے دیتے ہیں کہ جہاں تک عام مسلم معاشرے کا سوال ہے مسلمانوں میں تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور کی بلندی اور فکر میں گہرائی وگیرائی اور مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے سماج کا حصہ بنانا چاہئے تھا، مسلمانوں کی ترقی ہندو سماج کے ساتھ ساتھ شانہ بشانہ اور قدم بقدم چلنے میں تصور کرتے تھے۔ آپ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ محبّ وطن اور قوم پرست رہنما بھی تھے۔ ہندوستان جیسے کثیر المذاہب، مختلف اقوام وملل، رنگ ونسل، بول چال، ثقافت وکلچر، تہذیب وتمدن اور کثیر اللسان معاشرے میں وہ اس طرح کی تعلیم کا تصور رکھتے تھے جو ہندوستانی ماحول اور کثیر ثقافتی و مذہبی معاشرے کے تقاضوں کو بہتر طریقے سے پورا کرے۔ لسان اور سوشل ریفارم نامی مضمون میں پروفیسر محمد ظفر الدین صاحب (مرحوم) رقمطراز ہیں:

''سوشل ریفارم کا لفظی ترجمہ ''سماجی اصلاح'' یا اصلاح معاشرہ کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں چونکہ ہم مولانا آزاد کے سوشل ریفارم کی بات کر رہے ہیں اس لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ سوشل ریفارم کے اس تصور تک رسائی حاصل کی جائے جو خود مولانا آزاد کے ذہن میں تھا۔ انہوں نے لسان الصدق کے پہلے شمارے میں رسالے کے خاص مقاصد بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ''سوشل ریفارم، یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔

گوشۂ آزاد

مولانا آزاد کی تمام تر صحافتی اور مذہبی تصنیفات میں جو پہلو سب سے زیادہ شدت سے سامنے آتا ہے وہ اصلاح معاشرہ ہے، وہ ہر جگہ مسلمانوں کی معاشرتی برائیوں کو دور کرنے، انہیں تعلیم کی طرف مائل کرنے اور ایک بیدار محبِّ وطن شہری بنانے کے لئے شعوری طور پر کوشاں نظر آتے ہیں۔ بچپن ہی سے انہوں نے معاشرے کی برائیوں کو محسوس کیا اور خود کو اس کی اصلاح کے لئے وقف کر دیا تھا۔ مولانا آزاد نے ان اصلاحی کوششوں کے لئے قلم کو اپنا ہتھیار بنایا اور عوامی سطح پر لوگوں تک پہنچنے کے لئے صحافت جیسا موثر وسیلہ اختیار کیا۔

(مولانا آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی رائے، خیالات، فکر و احساس کو مختلف اہم زمروں میں بیان کیا ہے۔ اسے مختصراً بتانے کی سعی کرتے ہیں۔

(ا) آزادی کے بارے میں ان کے خیالات: آزادی کے متعلق انہوں نے کیا لکھا، کیا کہا ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفتہ وار الہلال کی اشاعت کا مقصد مذہب کے ساتھ سیاسی بھی تھا۔ چنانچہ ہمارے ملک ہندوستان کی آزادی ہندوستان اور مسلمانوں کے لئے کیا معنی رکھتی ہے۔ اس تعلق سے انہوں نے الہلال ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں اپنے قلم و فکر کی جولانی دکھاتے ہوئے صفحۂ قرطاس پر قلم یوں رقم ہوا تھا۔ ''ہندوستان کے لئے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد داخل حب الوطن ہے' لیکن مسلمانوں کے لئے یہ ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی پر وہ کوشش داخل ہے جو حق وصداقت اور انسانی بند واستبداد اور غلامی کو توڑنے کے لئے کی جائے''۔ (مولانا آزاد کا سیاسی تدبر۔ ڈاکٹر وہاب قیصر)

دراصل مولانا آزاد کے یہاں آزادی کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی اس کی طرف راغب کرنے اور ملک کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے لئے انہوں نے تحریر و تقریر سے مسلمانوں میں حب الوطنی، آزادی کے لئے جوش بھرا، امنگیں بڑھائیں جذبات کو پروان چڑھایا۔ الغرض ہر طرح سے ملک کی آزادی کے لئے مسلمانوں کو جگایا، بیدار کیا اور آگے بڑھایا تو ساتھ ہی ساتھ ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ ملک کے مستقبل کو دیکھا۔ مولانا آزاد کے لئے ایک موقع ایسا آیا کہ وہ مخالفین کو مسکت جواب دینے میں کامیاب ہی نہیں رہے بلکہ مخالفین سے موافقین اور مسلمانوں کے تئیں بھلائی کا جذبہ بھی بیدار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مولانا نے اپنی ساری قوت و طاقت اور علم و حکمت کو اس متحدہ پلیٹ فارم کے لئے جھونک دیا اور ان کی یہ بلند بانگ صدائے دل تحریر کی صورت میں ہمیشہ ہمیں بیدار کرتی رہے گی۔ ایک عظیم موقع پر مولانا نے انڈین نیشنل کانگریس کے جلسہ میں ہندو مسلم اتحاد پر اپنے پر مغز خطاب میں کہا تھا:

''ہندو مسلم اتحاد ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندوستان کی آزادی کی وہ تمام

گوشۂ آزاد

باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لئے ہوسکتی ہیں محض خواب وخیال ہیں۔صرف یہی نہیں کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے۔آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہوکر یہ اعلان کردے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان، ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہوجائے تو میں سوراج سے دستبردار ہوجاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا۔کیونکہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا''۔

(خطبات آزاد، مالک رام،ص205)

(۳)دوقومی نظریہ:

مولانا ابوالکلام آزاد مسلمانوں میں اتحاد اور اخوت و محبت چاہتے تھے تو ساتھ ہی ساتھ وہ ہندو پاک کی تقسیم کو سرے سے خارج کرتے ہوئے ہندو پاک میں بالکل بھی تقسیم نہ چاہتے تھے۔مگر جب مولانا آزاد نے دیکھا کہ ملک کی تقسیم ناگزیر ہوچکی ہے۔آزاد لاکھ اس کے مخالف رہے ہوں لیکن انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ اس انہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔بایں ہمہ انہوں نے مسلمانوں کے نام 15/اپریل 1946ء کو ایک عظیم بیان جاری کیا تھا جس سے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہندو پاک کی تقسیم کی مخالفت میں دل و جان سے شریک دیکھا جاسکتا ہے۔

''اب ہندوستان کی تقسیم ایک حقیقت بن گئی ہے۔دس سال پہلے میں نے جو کہا تھا وہی ہوا۔مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی حلق سے نہیں اترتا۔میں نے قطعی رائے ظاہر کی ہے اور اب بھی کہوں گا کہ پاکستان کی اسکیم پر ہر پہلو سے غور کیا ہے اور خاص طور سے اس پر بھی کہ اس کا اثر مسلمانوں کے مستقبل پر کیا پڑے گا۔یہ مسلمانوں کے لئے سخت نقصاندہ مسائل کھڑے کردے گی اور پاک و ناپاک علاقوں کی یہ تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے بلکہ اسلام سے انحراف ہے۔اسلام ایسی کسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا۔جبکہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ خدا نے پوری دنیا کو میرے لئے مسجد بنایا ہے۔اس کے علاوہ بھی پاکستان کی اسکیم شکست کی علامت ہے۔'' (مولانا آزاد کی سیاسی ڈائری، بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد فکر وعمل کے چند زاویئے،ص109)

مولانا محترم ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ صورتحال کو اپنی دوربیں نگاہوں سے دیکھ رہے تھے تبھی تو ایک موقع پر اتر پردیش کی سرزمین سے پاکستان جانے والے ایک قافلہ سے محو گفتگو ہوکر جو خدشات، تکلفات اور دلدوز واقعات اور اندوہناک سانحہ کی تصویر کشی کی تھی انہی کی زبان سے ملاحظہ کریں:

''آپ مادر وطن چھوڑ کر جارہے ہیں۔آپ نے سوچا اس کا انجام کیا ہوگا؟ آپ کے اس طرح فرار ہوتے رہنے سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان کمزور ہوجائیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب پاکستان کے

علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کا دعویٰ لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔ کیا اس وقت آپ کی پوزیشن پاکستان بن بلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہیں رہ جائے گی؟ ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہوسکتا ہے قومی اور وطنی مخالف نہیں۔ آپ اس صورتحال سے نمٹ سکتے ہیں۔ مگر پاکستان میں آپ کو کسی بھی وقت قومی اور وطنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، جس کے آگے آپ بے بس ہوجائیں گے''۔ (ایضاً، ص110-109)

واقعی مولانا ابوالکلام آزاد کے دل کی یہ صدا تھی اور 'دل سے جو آہ نکلتی ہے اثر رکھتی ہے' آج جو کچھ پاکستان میں ہورہا ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے یقیناً مولانا کی نظریں مستقبل کو دیکھ رہی تھیں اور زبان سے وہی ادا ہورہا تھا جو کہ ہونے والا تھا بس سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں کیا جاسکتا ہے، جو ہونا تھا وہ ہوچکا اور بس۔

(۴) بین الاقوامی سیاست پر ان کا نظریہ: دوسری جنگ عظیم کے موقع پر جب کہ برطانیہ پر جنگ کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ ہندوستان کی جنگ میں شمولیت ضروری سمجھی جارہی تھی اور ایسے وقت میں ہندوستان میں صدر کانگریس کے عظیم عہدہ پر فائز عظیم القدر مدبر و سیاست داں آزاد براجمان تھے۔ ایسے نازک حالات اور سنگین گھڑی میں ان کی دور بینی، مستقبل شناسی اور معاملہ فہمی سے ان کی بین الاقوامی سیاست پر پکڑ اور نظر و نظریہ کو اچھی طرح واضح کرتا ہے اور انگریزی سرکرپس جو پیشے سے وکیل تھے کی مکاری و چالاکی کا جس نہایت و متانت و سنجیدگی سے جواب دیتے ہیں یہ مولانا کی ہی شان ہے اور اس پورے اور اہم معاملہ کو انہوں نے گویا چٹکی میں حل کردیا۔ 1908ء کی ابتداء میں مولانا نے عراق، شام، ترکی اور مصر کا دورہ کیا اور ان ملکوں کے جمہوریت پسند اور آزادی کے خواہاں زعماء و قائدین سے تعارف و تعلق پیدا کیا۔ اس تعارف، تعلق اور رابطے نے ابوالکلام آزاد کے فکری و عملی موقف کو مزید تقویت پہنچائی جیسا کہ خود اس کے متعلق مولانا کا قلم یوں گویا ہے:

''کلکتہ چھوڑنے سے پہلے میں سیاسی خیالات کے اعتبار سے انقلابی سرگرمیوں کی طرف مائل عمل ہو چکا تھا۔ جب میں عراق گیا تو وہاں چند عراقی انقلابیوں سے ملاقات ہوئی۔ مصر میں مصطفیٰ کمال پاشا کے کچھ پیروؤں سے تعلقات پیدا ہوگئے۔ ینگ ٹرکش گروپ سے بھی ملا جس نے قاہرہ میں اپنا مرکز قائم کیا تھا اور وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار شائع کرتا تھا۔ جب میں ترکی گیا تو ینگ ٹرکش تحریک کے چند لیڈروں سے دوستی ہوگئی۔ ہندوستان واپس آنے کے کئی سال بعد تک میری ان کی خط و کتابت جاری رہی''۔ (ہماری آزادی: بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے، ص۲۳۱)

ہندوستان میں متحدہ و متفقہ قومیت کی ضرورت کے تحت انہوں نے کارہائے نمایاں خدمات انجام دیئے تھے۔ اس سلسلے میں مضامین تحریر کئے، تقریر اور صحافت

گوشۂ آزاد

وخطابت کے ذریعہ بھی اہم رول ادا کیا۔مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کی متفقہ قومیت کے متعلق یوں تحریر کیا کہ ''سرزمین ہند بھی قدرت کی نادرہ کاریوں کی ایک بوقلمی گلدستہ ہے'' اپنی مختلف طبیعی کیفیات ومناظر،تنوع آب وہوا، کثرت قومیت ومذہبیت،تلوین پیداوار سے اس جہان ارضی کا ایک محیرالعقول عجائب خانہ ہے۔ مزید یوں کہ آج اگر قومیت کا احساس پیدا ہوجائے تو ہماری تدابیر کارگر ہوسکتی ہیں،ہم دنیا میں آدمی بن کر رہنے کے مستحق ہوجائیں گے اور اقوام عالم ہم کو زندہ جماعت سمجھنے لگیں گی۔ ہندو ایک قدم اپنی روایات قدیمہ سے نہ ہٹے،مسلمان ایک انچ اپنی آیات ربانی اوراحکامات قرآنی سے نہ سرکے، پارسی اپنی مذہبی کتاب کی تلاوت کرتا رہے،سکھ اپنے گرنتھ صاحب کا احترام مدنظر رکھے۔ ہندو کا ایقان وید،گیتا پر غیر متزلزل رہے،مسلمان کا ایمان قرآن وحدیث پر غیر فانی رہے،سکھوں اور پارسیوں کے عقائد مذہبی ودینی میں ایک چاول برابر لغزش نہ ہو، پھر بھی وہ صدق دل،خلوص نیت،مستقل ارادے اور سچے خمیر کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے۔ ہندوستان اس کی مایہ، ہندوستان اس کی عزت، ہندوستان میں وہ پیدا ہوا ہندوستان میں مرے گا''۔متحدہ قومیت ایک عام نقطۂ نظر سے بنتی ہے،ایک غرض مشترکہ سے پیدا ہوتی ہے۔اس طرح سے ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم نے ہندوستان میں امن ومحبت بھائی چارگی کو برقرار رکھتے ہوئے ترقی کے اصول بتائے، ایسے وقت میں جبکہ ہرطرف انتشاروافتراق کا دوردورہ تھا آزادی کے ساتھ ہی وطن دوحصوں میں تقسیم ہوگیا تھا مگر مولانا آزاد نے وطن سے محبت اوروطن پر اپنی جان نچھاوراور وطن کوترقی دینے کے کئی بیش بہااوراہم اصول بھی بتائے۔

الغرض اتنی سی گفتگو کے بعد مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت،فکری صلاحیت اور تدبیروسوچ اوران کے قائدانہ صلاحیتوں کی کچھ نہ کچھ جھلک تو قارئین محسوس کرہی لیں گے لیکن میری ناقص رائے میں مولانا آزاد کی سیاسی قائدین و رہنما میں وہی حیثیت ہے جو بقول پروفیسر عابد پشاوری ''جو بینکوں میں ریزروبینک کی ہے۔ ریزروبینک، بینکوں کا بینک ہے۔ مولانا آزاد لیڈروں کے لیڈر ہیں''۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات ونظریات اورآراء کا بھی لیڈران احترام کرتے ہیں اورانہیں قدروعزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کئی بار جب تحریک میں تعطل کی کیفیت پیدا ہوئی تو مولانا نے اسے نہ صرف توڑا بلکہ تحریک کوازسر نو فعال بنانے اورآگے بڑھانے میں بھی کامیاب ہوئے اس لئے آج کے دور میں ان کے افکارکوعملی جامہ پہنانے کی اشد ضرورت ہےاوربس۔

☆☆☆

محمد خوشتر
ریسرچ اسکالرشعبۂ اردو،اسکول آف ہیومانیٹیز،
یونیورسٹی آف حیدرآباد، گچی باؤلی، حیدرآباد۔500046
موبائل:8341116397

فکرِ اقبالؔ میں مقامِ زن

جدید اُردو شاعری کے حوالے سے علاّ مہ اقبالؔ کا مقام ومرتبہ بہت بلند، اعلیٰ وارفع ہے۔علاّ مہ اقبالؔ کی شاعری میں جذبے کی فراوانی،الفاظ کی موسیقی،نئی نئی تراکیب،تشبیہات اور تلمیحات ملتی ہیں۔علاّ مہ کے کلام کے مقاصد ،پیامات،افکار اور تصوّرات جداگانہ ہیں۔علاّ مہ کی شاعرانہ جولانی،خریطہء جواہر،لعل و گہر، حسنِ نزاکت، دیدہ وری،تشریح وترجمانی، پھولوں میں خوشبواور ستاروں میں روشنی کی طرح سب پر عیاں ہیں۔علاّ مہ اقبالؔ نے جہاں اپنی شاعری میں کئی ایک عناوین کواپنا موضوعِ کلام بنایا ہے وہیں پرایک اہم اور دلچسپ موضوع عورت بھی ہے۔ بلکہ ہروہ عنوان کواپنا موضوع کلام بنایا جس کووہ بہت اہم سمجھتے تھے۔علاّ مہ دنیا کی چیزوں کی رفتار،زمانے کی روش،واقعات کے اظہاراور کائنات میں چلنے والی لہروں کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں اوران کی تفسیر وترجمانی اپنے کلام کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔

عورت کا کردار،عورت کا مقام،عورت کا رتبہ،عورت کا امتیاز،عورت نام کا غلط استعمال،عورت کا پردہ،مظلومِ نسواں،آزادئ نسواں،عورت بحیثیت ماں،عورت کی تعلیم،عورت کی حفاظت،عورت کی عزت،کائنات میں عورت کا وجود ورنگ،اور مردوزن میں بالادستی وغیرہ یہ وہ موضوعات ہیں جنھیں علاّ مہ اقبالؔ نے عورتوں سے متعلق اپنے کلام کا حصّہ بنایا۔ یہ موضوعات اپنے اندر اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ ان پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔لیکن یہاں موقع کی نزاکت اور وقت کی تنگ دامنی اختصار پر مجبور کرتی ہے۔میرے اس مضمون میں علاّ مہ اقبال کی تحریروں اور تقریروں سے اقتباسات کے علاوہ معاصر علماء اور ماہرینِ اقبالیات کی علاّ مہ سے متعلق چند نگارشات بھی شامل ہیں۔

علاّ مہ اقبالؔ بنیادی طور پر عورت کے احترام کے قائل ہیں اور عورت کے مسائل کو دوسرے مسائل سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔زندگی کے داخلی وخارجی مسائل کے حوالے سے علاّ مہ اقبالؔ نے عورت کو بڑا رتبہ دیا ہے۔اور یہ امر بھی سب پر عیاں ہے کہ علامہ عورتوں سے متعلق جونظریہ یا پھر طرزِ حیات اپنے کلام میں پیش فرماتے ہیں وہ عین بانیء اسلام،پیغمبرِ اسلام محمدِ عربی ﷺ سے بالکل ملا ہوا ہے۔

علاّ مہ اقبالؔ کوعالمِ عرب میں تعارف کروانے والی شخصیت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی عربی کتاب ’روائع اقبال‘ کا ترجمہ ’نقوشِ اقبال‘ کتاب کے مترجم مولوی شمس الدین تبریز خاں کے مقدمہ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی یوں رقمطراز ہیں۔

’’زمانہء قدیم سے عورتوں کے ساتھ عام طور پر جیسا ناروا سلوک کیا جاتا تھا اوران کی عزت وعافیت کی طرف سے جوافسوس ناک غفلت برتی جاتی رہی،یا دوعالمی جنگوں کے بعد دفعۃً تمام بندھنوں کے ٹوٹ جانے سے ان کو جوآزادی ملی اس کا اظہار یا مظاہرہ انہوں نے جس طرح کیا اس کا واضح نقشہ حالیؔ واقبالؔ کے کلام میں ملتا ہے،اقبال نے آزادی میں ان کی خواری دیکھ کر ضربِ کلیم اور جابجا دوسری نظموں میں ان کے احترام میں جو کچھ فرمایا ہے،اس سے کون اتفاق نہ کرے گا۔‘‘

جنوبی ہند کی ریاست تامل ناڈو کے صدر مقام سرزمین مدراس پر ۷/جنوری ۱۹۲۹ء کوانجمن خواتین مدراس کے استقبالیہ جلسہ سے علامہ اقبال کے خطاب کے چند اہم اقتباسات میرے موضوع سے متعلق بہت اہمیت کے حامل ہیں:

’’ا۔اگر میری تحریروں نے خواتین کے دلوں میں اسلامی روایات کا احترام پیدا کیا ہے تو ربِّ کعبہ کی قسم میں سمجھتا ہوں کہ میری مراد پوری ہوگئی۔

۲۔میرا عقیدہ ہے کہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس کی قوم کی عورتیں ہی کرسکتی ہیں۔

۳۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں مردوزن میں قطعی مساوات ہے۔ میں نے قرآن پاک کی آیت سے یہی سمجھا ہے۔

۴۔عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں ان فرائض میں اختلاف ہے اگر چہ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ ہے فرائض کا اختلاف اور وجوہ پرمبنی ہے مطلب یہ ہے کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے اسلام میں عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں۔

۵۔اگر آپ ان حقوق پر نظر ڈالیں جو اسلام نے عورتوں کو دئے ہیں تو آپ پر واضح ہوجائے گا کہ اس مذہب نے عورت کو کسی طرح بھی مرد سے ادنیٰ درجے پر نہیں رکھا۔

۶۔ پردے کے سلسلے میں اسلام کا عام حکم عورت کو یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کو (غیر مرد کے سامنے) ظاہر نہ کرے۔

۷۔ جو حقوق ملتِ اسلامیہ نے عورتوں کو دیئے ہیں وہ اُن کے حصول پر اصرار کریں۔ شوہر، باپ، بھائی کون سیاہ دل مرد ہوگا جو آپ کے حقوق دینے سے انکار کرے گا۔

۸۔ مسلمان عورتیں مسلمان قوم کی بہترین روایات کی حفاظت کرسکتی ہیں بشرطیکہ وہ اصلاح کا صحیح اور عقلمندانہ رستہ اختیار کریں۔ اور ترکی یا دیگر یوروپین ممالک کی عورتوں کی اندھادھند تقلید نہ کریں۔

۹۔ مسلمان عورتوں کے لیے بہترین اُسوہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں کامل عورت بننا ہو تو آپ کو فاطمۃ الزہراؓ کی زندگی پر غور کرنا چاہیئے اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعی کرنی چاہیئے۔ عورت کو اپنی انتہائی عظمت تک پہنچنے کے لئے فاطمہؓ نمونہ بہترین نمونہ ہے۔

عورت کا مقام و مرتبہ کائنات میں بہت اہم ہے جو مقام علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری میں عورت کو دیا ہے شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے دیا ہو۔ عورت کا وجود جہاں جنت کی نعوت ہے وہیں کائنات میں رنگ و رونق عورت کی ہستی ہی سے ہے۔ عورت کے وجود سے ہی زندگی ہے۔ اسی کی ذات سے زندگی کے ساز میں ایک سوز ہے اس کے بغیر یہ جہاں بے رنگ ہے۔ عورت کے شرف و منزلت کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کی مٹھی کی مٹی ثریا سے بڑھ کر ہے۔ اس کا وجود دل کا سرور ہے۔ اس کا وجود چھپے ہوئے موتی کی طرح ہے۔ ضربِ کلیم میں علامہ کہتے ہیں:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مُشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں

انسان کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے۔ نئی نسل کی تربیت کا انحصار ماں پر ہوتا ہے۔ ماں جتنی تہذیب کی علمبردار ہوگی، شائستہ و پاکیزہ ہوگی، بلند خیال و بلند حوصلہ ہوگی بچوں پر ان کا اثر ضرور بہ ضرور ہوگا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بالِ جبریل میں یوں کہتے ہیں:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی — سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

عورتوں کا مسئلہ قدیم بھی ہے جدید بھی۔ زیادہ الجھنا کم سلجھنا اس مسئلہ کا مقدر رہا ہے۔ قدیم تہذیب میں بھی یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا۔ اور اب جدید تہذیب میں تو زوروں پر ہے۔ کبھی اس مسئلہ پر جنگیں ہوئیں ہیں تو آج اس پر سیاست کی جارہی ہے۔ ہر دور میں اور ہر زمانے میں مدبّرین و مفکّرین اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ علامہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ اس میں قصور عورتوں کا نہیں ہے وہ تو اس مسئلہ میں مظلوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عورتوں کی شرافت کے گواہی تو 'مہ و پرویں' یعنی چاند اور ستارے بھی دیتے ہیں۔ یہ سارا فساد تو یوروپی تہذیب کی دین ہے۔ فساد کی جڑ تو فرنگی معاشرہ ہے جو اس مسئلہ کو ہمیشہ الجھا کر ہی رکھنا چاہتے ہیں تاکہ عورتوں پر اپنی بالادستی قائم رہے۔ ضربِ کلیم کی ایک نظم ملاحظہ ہو۔

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا — مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں — گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور — کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

عورت عفت کا نام ہے، عورت عظمت کا نام ہے۔ عورت پاکیزگی کا نام ہے، عورت شرم و حیا کی پیکر کا نام ہے، عورت سراپا عورت کا نام ہے۔ اس کا مذاق اُڑانا، تحریر و تصویر میں عریاں کرنا، دنیا میں اس کو سرِ عام بازار میں بے عورت کرنا۔ چاہے وہ اشتہار کی شکل میں ہو یا پردہ سیمیں پر، ادیب کے ادب میں ہو یا شاعر کی شاعری میں، فن کار کے فن میں ہو یا مصوّر کی تصویر میں۔ عورت کو غلط انداز سے پیش کیا جانا، جس سے اس کی عفت، پاکیزگی، شرم و حیا نیلام ہوتی نظر آرہی ہو۔ اور اس سے ادب کی بلند خیالی و مقصدیت بھی فوت ہوتی نظر آتی ہو۔ علامہ اقبالؔ کو ہرگز ہرگز پسند نہیں علامہ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند — کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بیچاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار

علامہ اقبالؔ کی نظر میں عورت کا امتیازی شرف اس کے ماں ہونے میں ہے۔ معاشرتی اور عائلی زندگی میں ماں کا مقام مرکزی ہوتا ہے۔ نسلِ انسانیت کا باغ

گوشۂ اقبال

اسی وقت لہلہا تا رہے گا جب عورت میں اُمومیت (حق مادری) کا جذبہ بے دار رہو۔ جب عورت سے اس کا جذبہ اُمومیت چھین لیا جائے گا تو نسلِ انسانی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ خاندانوں کا چین وسکون درہم برہم ہو جائے گا۔ سماج کا خون ہو جائے گا۔ چھوٹے بڑے کی تمیز ختم ہو جائے گی۔ معاشرہ میں بگاڑ ہوگا۔ علامہ اقبالؔ کے نظر میں مغرب اخلاقی بحران کا شکار اس لئے ہوا ہے کہ وہاں جذبہ اُمومیت ختم ہو رہا ہے۔ صنفی پاکیزگی تار تار ہو رہی ہے۔ فرنگی تہذیب کو نشانہ بناتے ہوئے علامہ کہتے ہیں:

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اُمومت ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت

علامہ اقبالؔ آزادیٔ نسواں کے اس لئے قائل نہیں ہیں کہ اس کا نتیجہ عورتوں کی غلامی ہے۔ اس سے ان کے مسائل سلجھنے کے بجائے الجھتے رہیں گے۔ آسانیوں کے بجائے مشکلات پیدا ہوں گی۔ یہ فرنگی تہذیب آزادیٔ نسواں کے نام پر معصوم بچوں سے ماں کی ممتا چھین رہی ہے۔ اس صنفِ نرم ونازک کو پر یشانیوں میں الجھا رہی ہے۔ گویا کہ بقیطی میں جنت دکھاتے ہیں پھر اسی عورت کا غلط استعمال کرتے ہوئے مذاق اڑاتے ہیں موج مستی کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ اس گھناؤنی سازش کے راز کو عورت ہی فاش کر سکتی ہے کہ آزادیٔ نسواں اصل میں ایک دھوکہ ہے:

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند!

عبدالسلام ندوی مرحوم اپنی کتاب 'اقبال کامل' میں علامہ اقبالؔ کے نظریہ پردہ سے متعلق یوں فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب عورتوں کی ترقی کے مخالف نہیں ہیں بلکہ وہ صرف ان طریقوں کے مخالف ہیں جو آزادیٔ نسواں کی تحریک نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اختیار کئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک خودی کی ترقی کا ذریعہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں آزاد ہو، عورت کی صلاحیتیں مرد کی صلاحیتوں سے مختلف ہیں، اور ان صلاحیتوں کو ایک بتانا اور ان کے فرق سے انکار کرنا فطرت کو منھ چڑھانا ہے۔''

علامہ اقبالؔ ایک موقع پر آزادیٔ نسواں سے متعلق لکچر دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں مرد اور عورت کی مساوات مطلق کا حامی نہیں ہوں۔ قدرت نے ان دونوں کے تفویض جدا جدا خدمتیں کیں، اور ان فرائض جداگانہ کی صحیح اور باقاعدہ انجام دہی خانوادۂ انسانی کی صحت اور فلاح کے لئے لازمی ہے۔ مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے۔ عورتوں کو آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظام معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے بھی جس حد تک کہ افراد قوم کی شرح ولادت کا تعلق ہے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہوں گے، خاندانی وحدت کے رشتہ کو جو بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا جزو اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے۔''

(ملّت بیضا پر عمرانی نظر، صفحہ ۳۸: از: روح اقبال، مصنف: ڈاکٹر یوسف حسین)

علامہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ مسلمان عورت کو معاشرہ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں پردہ کوئی مانع نہیں بنتا، وہ اس پردہ کے ساتھ بھی اپنا کام انجام دے سکتی ہے۔ پردہ عورت کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں۔ وہ اپنے تمام جائز امور، اپنے تمام فرائض کی ادائے گی اسی پردہ میں رہ کر بدرجہ اتم کر سکتی ہے۔ جس سے معاشرہ پر نیک اثرات مرتب ہوں گے۔ جب ذوق نظر اپنی حدود سے آگے نکل جاتا ہے تو خیالات پراگندہ واہتر ہو جاتے ہیں۔ یہی خیالات عورت کو غیر کے لئے زیب وزینت، بے پردگی، خودنمائی اور بے باکی کی طرف مائل کر دیتی ہے۔

پردہ کی تائید وحمایت میں علامہ نے ایک نظم ضرب کلیم میں 'خلوت' کے عنوان سے لکھی ہے:

رُسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے روشن ہے نگہ، آئینۂ دل ہے مکدّر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر، و لیکن خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسّر!

'نقوشِ اقبال' کتاب کے مترجم مولوی شمس الدین تبریز خاں 'نظم خلوت' کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ پردہ کی وجہ سے عورت کو یکسو ہو کر اپنی صلاحیتوں کو نسلوں کی تربیت پر صرف کرنے اور اپنی ذات کے امکانات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے، اس کے ساتھ ہی اسے سماجی خرابیوں سے الگ رہ کر اپنے گھر اور خاندان کی تعمیر کا سامان میسّر آتا ہے، گھر کے پرسکون ماحول کے اندر اسے زندگی کے مسائل اور معاشرتی موضوعات کو سوچنے سمجھنے کی آسانیاں ملتی ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے اور دوسروں کے لئے بہتر کارگزاری کر سکتی ہے۔''

تمام عورتیں کامیاب نہ سہی مگر ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ علاّمہ اقبالؔ کے نزدیک عورت کا کمال یہ نہیں کہ وہ علم و فضل میں ارسطو اور افلاطون بن جائے۔ بلکہ اس کا اصلی کمال و امتیاز یہ ہے کہ وہ ارسطو اور افلاطون کو پیدا کرے:

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی، لیکن — اسی کے شُعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

''اقبال شخصیت اور پیام'' کے مصنف طیب عثمانی ندوی یوں کہتے ہیں کہ:

''اقبال کے نزدیک عورت کی فطری جبلت اس کی نسوانیت ہے۔ سیاست ومعشیت، دفتر اور کارخانہ اس کے نسوانی حُسن اور جوہر کے لئے سم قاتل ہے۔ عورت کے حُسن و جمال کی تابنا کی اس کے نسوانی جوہر کی مرہون منت ہے۔ مکالمات فلاطوں نہ لکھنا اس کے لئے کوئی عیب نہیں، اس کا حُسن و ہنر یہ ہے کہ اس کی گود سے ایسے افلاطونِ علم وحکمت پیدا ہوں، جو ''مکالمات فلاطوں'' لکھ سکیں۔''

عورت اور تعلیم کے عنوان پر علاّمہ اقبالؔ نے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ عورت کا موجودہ مغربی طرزِ تعلیم کا حاصل کرنا ہے۔ گو کہ وہ عورت کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خلاف نہیں ہیں لیکن وہ تعلیم جو مغربی تہذیب وتمدن کے رنگ میں ڈوب کر حاصل کی جاتی ہے یا جس تعلیم سے عورت کے مقامِ اُمومیت کے سلب ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اس سے وہ باخبر کرتے ہیں۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب سے متاثر لڑکیاں جذبۂ اُمومیت سے محروم ہیں۔ وہ کس قدر ماں بننے سے گھبراتی اور بچک جاتی ہیں یہ کسی سے پوشیدہ بھی نہیں ہے۔ عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے انسانیت کی موت اقبال کو برداشت نہیں ہوئی۔ اور بڑی لجاجت کے ساتھ کہتے ہیں:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہُنر موت

میرے ہم نامی ''اقبال شخصیت اور پیام'' کے مصنف طیب عثمانی ندوی ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

''جس علم سے جنس لطیف ''جنس کثیف'' بننے کی کوشش کرے اور جس علم سے نسوانیت کا خون ہو، جس سے عورت میں ''نسائیت'' کے بجائے بہ تکلف ''رَجلیت'' کا اظہار ہو، وہ علم، علم نہیں بلکہ موت ہے، اور یہ انسانیت کے لئے ایک المناک حادثہ، اور اس کی موت کا پیام ہے۔'' (اقتباس)

ایک پیشین گوئی کے طور پر علاّمہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ قوم وملّت کی لڑکیاں انگریزی تو پڑھ رہی ہیں لیکن ان کے مدِ نظر انگریزوں کے طور طریقے ہیں اور وہ اپنی تہذیب پر چلنا گناہ سمجھتی ہیں۔ تعجب اس پر ہے کہ وہ اس کو فلاح کی راہ سمجھ رہی ہیں۔ بھلا ان حالات میں اس کا نتیجہ کیا درآمد ہوگا یہ تو پردہ اُٹھنے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔ یہ تو ہم آج روز افزوں یوروپی نظریہ کی تعلیم گاہوں میں دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہر دن نئے نئے ڈرامے ہمیں کیا کیا سین دکھا رہے ہیں۔ بانگِ درا میں علاّمہ یوں کہتے ہیں:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر — وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گُناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین — پردہ اُٹھنے کی مُنتظر ہے نگاہ

علاّمہ اقبالؔ ایک سوال یوروپ کے داناؤں سے کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی پروردہ معاشرت سے متاثر مرد وزن جو ہند اور یوناں والے ہیں۔ مرد بھی بے کار ہو گئے ہیں اور عورتوں کی گودیں اولاد سے خالی ہیں۔ کیا یہی ان کی معاشرت کا کمال ہے؟ کیا یہی تمہاری تہذیب کی دین ہے؟ ضربِ کلیم کا ایک سوال:

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے — ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال — مرد بے کار و زن تہی آغوش!

گوشۂ اقبال

علامہ اقبال یورپ میں مغربی تہذیب کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔ان کے طور طریقوں کو پرکھتے ہیں۔عورتوں کے مقام کی حفاظت کے بارے میں سوچتے ہیں۔انہیں ایک رازِ حقیقت کی بات سمجھ میں آتی ہے۔پھر وہ یورپ سے اُس رازِ حقیقت کو سینے میں چھپائے ہند لے آتے ہیں۔اور اس راز کا افشاں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ زندہ حقیقت سمجھنے کے لئے رگوں میں گرم لہو چاہیئے۔اور جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ سمجھا اُس قوم کا خورشید بہت جلد زرد ہوگیا یعنی زوال ہوگیا۔وہ راز کیا ہے؟ خود اقبال کی زبانی سینئے جو عورت کی حفاظت کے عنوان پر ضربِ کلیم میں موجود ہے:

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور — کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پُرانی — نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا — اُس قوم کا خورشید بہت جلد ہُوا زرد

علامہ اقبال مظلومِ نسواں کے معترف ہیں کہ دنیا عورت کو جو مقام دینا چاہیئے وہ دے نہ سکی۔اس مظلومی نسواں پر میں بھی بہت غمگین ہوں۔بہت مشکل ہے اس گتھی کا کھلنا۔

مَیں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غم ناک بہت — نہیں ممکن مگر اس عُقدۂ مشکل کی کُشود!

علامہ اقبال کی نگاہ میں مثالی عورت، مثالی ماں، مثالی بیٹی، اور مثالی بیوی کا جو تصوّر ہے جس کو وہ آئیڈیل یا نمونہ اور شمع ہدایت کے چراغ کے طور پر تمام کائنات کی عورتوں، ماؤں، بیٹیوں اور بیویوں کے لئے ان کی سیرت وصورت، اخلاق وعادات، سادگی وبردباری، ہمت وجفاکشی، فرمانبرداری واطاعت گذاری، ان کے صبح وشام، ان کا رہن سہن، ملنا جلنا، نشست وبرخواست، تنہائی وبے داری، گویا کہ زندگی بھی اور موت بھی پیش کرنا چاہتے ہیں وہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی ذاتِ گرامی ہے۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول — مادراں را اسوۂ کامل بتول

خوش نصیب ہیں وہ مائیں جن کی گود نے ایسے جیالے پیدا کئے۔سلام ہے ان ماؤں کو جن کے بطن سے حضرات حسنؓ وحسینؓ، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت محمد بن قاسمؒ، حضرت طارق بن زیادؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام غزالیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبالؒ جیسے مفکر پیدا کئے۔ہماری اور آپ کی ماؤں کو بھی سلام جن کے بطن سے ہم نے جنم لیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طیب علی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، نیو کالج، 147 پیٹرز روڈ، رویاپیٹہ، چنئی 600014 تامل ناڈو۔ موبائل : 8870612461

غزل

ان شوخ حسینوں کی ادا اور ہی کچھ ہے — اور ان کی اداؤں میں مزا اور ہی کچھ ہے
یہ دل ہے مگر دل میں بسا اور ہی کچھ ہے — دل آئینہ ہے جلوہ نما اور ہی کچھ ہے
ہم آپ کی محفل میں نہ آنے کو نہ آتے — کچھ اور ہی سمجھے تھے ہوا اور ہی کچھ ہے
بےخود بھی ہیں ہوشیار بھی ہیں دیکھنے والے — ان مست نگاہوں کی ادا اور ہی کچھ ہے

آزاد ہوں اور گیسوئے پیچاں میں گرفتار
کہہ دو مجھے کیا تم نے سنا اور ہی کچھ ہے

مولانا ابوالکلام آزاد

علامہ اقبالؔ کا تصوّرِ فن

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے، خونِ جگر سے نمود!
قطرۂ خونِ جگر، سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

علامہ اقبالؔ کے مشہور اشعار ہیں جو ان کی شاہکار نظم ''مسجدِ قرطبہ'' کی زینت بنے ہیں۔ ہر کسی نے پڑھے یا سنے ہوں گے یا ہمارے حافظے میں محفوظ بھی ہوں گے۔ ان اشعار سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حکیم الامت علامہ اقبالؔ تصوّرِ فن کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے؟ فنونِ لطیفہ کے بارے میں ان کی فکر کیا تھی؟ کیونکہ اوپر جو اشعار مذکور ہوئے ہیں ان اشعار سے فنونِ لطیفہ پر روشنی پڑتی ہے۔ مذکورہ اشعار سے علامہ اقبالؔ کے تصوّرِ فن پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بات عیاں اور صاف ہوجاتی ہے کہ فن سے ان کے یہاں کیا مراد ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی اس نقطے کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ فن کا مقصد اور افادیت ایک معاشرے میں کیا ہونی چاہیے تو اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ علامہ اقبالؔ آرٹ یا فن کے متعلق کیا نظریہ رکھتے تھے؟ اس تناظر میں ان کے شعری تخلیقات اور مکتوبات کے مطالعہ سے اس پہلو کی بھی وضاحت اور صراحت ہوتی ہے۔ اس طرح شاعرِ مشرق فن کے بارے میں کیا خیالات رکھتے تھے واضح اور نمایاں ہوجاتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ کے یہاں کوئی بھی فن یعنی فنونِ لطیفہ ہو جب تک اس میں خونِ جگر، ''اقبالؔ نے جس چیز کو ''خونِ جگر'' کہا وہ اس کا فنّی اخلاص ہے جس کی پرورش جذبے کی آغوش میں ہوتی'' شامل نہ ہو یا بہ الفاظِ دیگر جگر کاوی، عرق ریزی اور سخت مشقت شامل نہ ہو تب تک کوئی فن اپنے عروج پر نہیں پہنچتا ہے۔ اور یہی وہ عناصر ہیں جن سے ایک فن پارہ شاہکار کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ علامہ اقبالؔ کے نزدیک اعلیٰ درجے کی فنّی تخلیق بغیر غیر معمولی محنت اور ریاضت کے ممکن نہیں۔ حالانکہ وہ لکھتے ہیں ''مصرعۂ من قطرۂ خونِ من است'' علامہ اقبالؔ کی فنّی ریاضت کو دیکھ کر ہمارا ذہن ان اشعار کی طرف مبذول ہوجاتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد
کوشش سے کہاں مردِ ہُنر مند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

فنونِ لطیفہ ہر فن کار سے محنتِ شاقہ، لگن، مسلسل

گوشۂ اقبال

ریاضت اور انتہائی شوق کا مطالبہ کرتا ہے۔ یوسف حسین خان کے مطابق ''اگر چہ اقبال کی فنی تخلیق میں ہمیں ہر جگہ ریاضت اور انہماک نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جذبہ وتخیل کے اظہار میں کہیں بھی آورد نہیں''۔

فن کے لفظ پر جب غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے مختلف لغات میں دئے گئے لغوی معنی کی طرف ہمارا ذہن متوجہ ہوجاتا ہے اور لفظ فن کے معنی اور مطالب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اردو لغت میں لفظ ''فن'' کے یہ معنی دئے گئے ہیں۔ ''ہُنر، کاریگری، گُن، طرز، ڈھنگ وغیرہ کے مطالب ملتے ہیں''۔

اردو زبان کا لفظ ''فن'' انگریزی زبان کے لفظ آرٹ (ART) کا متبادل مانا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں آرٹ کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

''کمالِ موسیقی، مصوّری اور تکنیکی مہارت کے انداز کو فن کہتے ہیں''۔

ایک اور لغت میں فنی ہیئت کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے:

''ارسطو کے نزدیک ہیئت صرف ظاہری شکل و شباہت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ متشکل کرنے کا رویّہ ہے جو نہ صرف خاکہ، شکل اور سیرت کو متشکل کرتا ہے بلکہ اُن اصولوں کو ترتیب دیتا ہے جو سیرت سازی کرتے ہیں''۔[۴] اس تعریف کی تشریح کرتے ہوئے اور فن کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّد علی حیدر اس تناظر میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''اس طرح واضح ہوجاتا ہے کہ صرف ظاہری شکل و شباہت کو ہئیت یا فن نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ ادبی رویّہ اور عمل ہے جو کسی ادب پارہ کے موضوع و مواد کو صحیح مقصد عطا کر کے داخلی، ظاہری اور جسمانی حُسن بخشتا ہے جسے حُسنِ الفاظ، زبان اور اندازِ تحریر کے نام دئے جاسکتے ہیں۔''

عظیم فن کار لکیر کا فقیر نہیں ہوتا ہے۔ وہ ہر آن اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے فن میں تبدیلی لانے کی کوشش میں رہتا ہے۔ ہر نئے موضوع کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی تگ و دَو میں مصروف رہتا ہے۔ وہ اپنی فنکارانہ مہارت اور فنّی صلاحیتوں سے فن پارہ یا ادب پارہ کو فن کی نئی راہوں سے واقف کراتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے رابرٹ لوئیس اسٹیونس کی رائے اہمیت رکھتی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

''سچا فن کار ہر نئے موضوع کے ساتھ اپنا طریقہ کار بدلتا رہتا ہے''۔

عظیم فن کار سماج میں تب اپنی چھاپ چھوڑتا ہے جب اُس کا فن حیرت واستعجاب اور چونکانے والے امتیازی خصوصیات کا حامل ہو۔ جب اُس کا فن نیا پن اور تازگی کے احساس سے لبریز ہو۔ یہی وہ جُز یا چیز ہے جس سے قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے اور وہ محظوظ بھی ہوجاتا ہے۔ ایک اچھے اور سچے فن کار سے قارئین، سامعین، حاضرین اور تماشائی اسی عُنصر کے متلاشی ہوتے ہیں اور اس کا مطالبہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اگر اُس کے فن میں نیا پن نہیں ہوتا تو لوگ اُس

کے فن پارے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ایک بڑے فن کار کی پہچان، شناخت اور انفرادیت اُس کے فن میں نیا پن اور تازگی اور موضوع و مواد کو فن کارانہ بصیرت اور تکنیکی مہارت کے اصولوں کے اطلاق کے سبب قائم و دائم رہتی ہے۔ڈاکٹر روتھ نے اس بارے میں عمدہ خیال کا اظہار کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''فن میں ہمیشہ نیا پن آتے رہنا چاہئے۔اس کا تخلیقی اثر استعجاب پر مبنی ہوتا ہے۔اگر ایک بار اُس کی تازگی میں کمی آ گئی تو پھر قاری اُس سے منہ موڑ کر اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو جاتا ہے۔''

مفکرین اور دانشور حضرات نے آرٹ یا فن کی مختلف تعریفیں پیش کی ہیں۔ان تعریفوں اور آراء کا خلاصہ اور نچوڑ مختصر الفاظ میں بیان کیا جائے تو آرٹ یا فن کا دوسرا نام تخلیقِ حسن ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے الفاظ میں آرٹ یا فن سے متعلق مبصّرین کی طویل فلسفیانہ اور پیچیدہ بحثوں کا خلاصہ کر لیں تو اختصار کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تخلیقِ حسن کا دوسرا نام آرٹ ہے۔فنونِ لطیفہ کے حوالے سے حُسن کی یہ تخلیق اگر خشت و سنگ کے وسیلے سے ظاہر ہو تو اس کا نام فنِ نقش گری یا فنِ تعمیر، خطوط اور رنگوں کے ذریعے ہو تو فنِ مصوری، بدن کے لوچ اور حرکات و سکنات کی مدد سے ہو تو فنِ رقص، صوت و زخمہ کے توسط سے ہو تو فنِ موسیقی اور حروف و الفاظ کی مدد سے ہو تو ادب ہوگا اور اگر ادب میں صوت و صورت کی وہ صفات بھی شامل ہو جائیں جن کا تعلق مصوری و موسیقی سے ہے تو پھر تخلیقِ حسن کا یہ عمل فنِ شاعری کہلائے گا۔

علامہ اقبالؔ ادب کے ذریعے زندگی کو سنوارنا اور سجانا چاہتے تھے۔لہٰذا وہ ادب برائے ادب کے نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل نظر آتے ہیں۔بلکہ میری یہ رائے ہے کہ اگر علامہ اقبال کے کلام کو غور سے دیکھا جائے تو وہ ادب برائے ترقی کے تصوّر کے قائل نظر آتے ہیں۔ان کی تخلیقات آفاقی پیغام سے مملو نظر آتی ہیں۔ان کی شاعری ہمیں حرکت، پیہم عمل، جدوجہد اور خودی جیسے اوصاف سے مزیّن نظر آتی ہے۔ان کی شاعری کا پیغام دنیا میں رہ رہے ہر انسان کے لئے ہے لیکن خصوصاً علامہ اقبال دنیا کے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں آگے دیکھنے کے متمنّی ہیں۔اب چاہے وہ ذہنی ترقی، علمی ترقی، معاشی ترقی، مذہبی ترقی، قانونی ترقی، سیاسی ترقی، سماجی ترقی ہو یا کوئی اور ترقی غرض ہر قدم پر مسلمانوں کی ترقی کے خواہاں نظر آتے ہیں۔اس سبب سے علامہ اقبالؔ ادب برائے ترقی کے نظریّے کے قائل نظر آتے ہیں۔ان کا ادب ترقی کی فکر سے مملو نظر آتا ہے۔وہ شعر و ادب کو مقصدی اور افادی پہلو کی فکر سے دیکھتے ہیں۔وہ اس آرٹ یا فن کو عزت کی نظروں سے دیکھتے ہیں جو انسان کی قوتِ عمل کو بیدار کرے اور مصائب و مشکلات کا سامنا کرنے کی قوتِ برداشت مضبوط اور توانا کرے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اقبالؔ کے تصورِ فن کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

گوشۂ اقبال

'' فن یا آرٹ کے متعلق اقبالؔ کی رائے یہ ہے کہ اسے بہرطور' بامقصد ہونا چاہئے ۔ بامقصد سے مراد یہ ہے کہ وہ زندگی کے اعلیٰ نصب العین کے حصول میں معاون و مدگار رہواور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ اس کا سوز وساز ،قوت کا مظہر،خودی کا محافظ اور زندگی کا نقیب ہو۔''

علامہ اقبالؔ نے جو مکتوب اپنے دوست واحباب کو لکھے وہ اس بات کی وضاحت کرتے نظر آتے ہیں کہ فن انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے لئے ہونا چاہئے ۔ جو فن اس پر کھرا نہیں اترے گا اس فن پر حکومت کی طرف سے قدغن ہونی چاہئے کیونکہ فن کا مقصد انسانی زندگی کی تعمیر ہونی چاہئے نہ کہ انسانی زندگی کا تنزّ ل۔اس تناظر میں خواجہ عبدالوحید لکھتے ہیں کہ ''ادبِ لطیف'' کی تعریف کے جواب میں اقبالؔ نے لکھا ہے کہ:

''اگر چہ آرٹ کے متعلق دو نظریے ہیں۔اوّل یہ کہ آرٹ کی غرض محض حسن کا احساس پیدا کرنا ہے، دوم یہ کہ آرٹ سے انسانی زندگی کو فائدہ پہنچنا چاہئے ۔ ان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہو۔ ہر چیز کو انسانی زندگی کے لئے مفید ہو، اچھا اور جائز ہے اور جو زندگی کے خلاف ہو، جو انسانوں کی ہمتوں کو پست اور ان کے جذبات عالیہ کو مردہ کرنے والا ہو قابلِ نفرت و پرہیز ہے اور اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہئے ۔''

علامہ اقبالؔ اس شعر وشاعری کے خلاف اور ان قلم کاروں اور فن کاروں پر اعتراض کرتے ہیں جو زوال پذیر فن کو اپنے فن پاروں میں برتتے ہیں ۔جس سے انسان اخلاقی ، جذباتی اور نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو کمزور پاتا ہے۔جس سے خون کی حرارت اور گرمی سرد پڑ جاتی ہے ۔جس سے زندگی کی رفتار اور ترقی ماند پڑ جاتی ہے۔اقبالؔ اُس فنِ شعر وشاعری کو ترجیح دیتے ہیں اور اعلیٰ گردانتے ہیں جس کا مقصد صرف اور صرف انسانی زندگی کو سنوارنا ،سجانا اور نکھارنے کا کام لیا جائے۔علامہ اقبالؔ اپنی شاعری سے بنی نوع انسان کے اندر خفتہ صلاحیتوں ،قابلیتوں اور اہلیتوں کو بیدار کرنا چہتے تھے۔ حالانکہ آپ نے فنونِ لطیفہ پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان فنون کا مقصد آپ کے نزدیک یہی ہے کہ انسانیت سازی ہو۔چنانچہ آپ کے کلام کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو آپ حسبِ ضرورت مختلف فنّی تدابیر اختیار کرتے ہیں ۔جن سے کلام میں تاثیر پیدا ہوتا ہے۔آپ کبھی یونانی حکماء کی طرح استفسار سے کام لیتے ہیں،کبھی تمثیل کا سہارا لیتے ہیں تو کبھی ڈرامائی عناصر کا استعمال کرتے ہیں۔اور یہی وہ عناصر ہیں جو علامہ اقبالؔ کے تصوّرِ فن پر روشنی ڈالتے ہیں۔اس طرح علامہ اقبالؔ ایک بڑے فن کار اور ہُنر مند کے طور پر اپنی شاعری تخلیقات کے آئینے میں نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

فردوس احمد بھٹ
ریسرچ اسکالر،شعبہ اردو' کشمیر یونیورسٹی
سری نگر' کشمیر 190006
رابطہ نمبر: 7006721821

ڈیجیٹل لرننگ کے دور میں اساتذہ کا کردار

خلاصہ:

جدید دور میں ڈیجیٹل لرننگ تعلیم کا ایک منظم طریقہ ہے۔ ڈیجیٹل لرننگ میں بھی ہم روایتی تعلیم کی طرح تعلیم کے مقاصد اور اغراض کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ڈیجیٹل اور آن لائن لرننگ کو ہم کورونا کے بعد اچھی طرح سے سمجھ سکے ہیں۔کورونا دور میں اساتذہ نے ڈیجیٹل وسائل سے تعلیم طلباء تک پہچانے کی کوشش کی ۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کورونا دور میں ڈیجیٹل لرننگ کے نظریاتی تصوّر کو عملی جامعہ پہنایا۔ڈیجیٹل لرننگ صرف آف لائن ذریعہ سے آن لائن آنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک تعلیمی عمل کا فعال حصّہ ہے ۔ڈیجیٹل لرننگ میں تعلیمی تکنیکی، ڈیجیٹل آلات، تدریسی مواد،مدّت اور مناسب پلیٹ فارم کے تحت تدریس کو کمرہ جماعت میں بحث ومباحثہ بنانا ہے۔اب تعلیمی تکنیکی سے آگے کا دور ڈیجیٹل لرننگ کا ہے۔ ہندوستانی حکومت نے ڈیجیٹل انڈیا پروگرام کے تحت عوام کی عام زندگی میں بھی ڈیجیٹل سہولیات فراہم کی ہے۔ڈیجیٹل تعلیم بھی ڈیجیٹل انڈیا کا اہم حصّہ ہے۔ تعلیمی تکنیک سے ہم تدریسی مواد کو طلباء تک پہنچاتے ہیں جبکہ ڈیجیٹل لرننگ میں نصاب کی سبھی سرگرمیوں کو شامل کیا جاتا ہے ۔ڈیجیٹل تعلیم اکتساب کی نفسیات تدریسی مواد کی پیش کش، اطلاعات جمع کرنا، تدریسی وسائل کی پہنچ بنانا، تعلیم میں ڈیجیٹل آلات کو استعمال کرنا وسائل کو جانچنا، ڈیجیٹل تعلیم میں جدیدیت کو بڑھاوا دینا واس کے مسائل کا مطالعہ کرنے کو شامل کر سکتے ہیں۔موبائل لرننگ کے دور میں ڈیجیٹل لرننگ بھی نئے راستوں پر چل پڑی ہے آج موبائل لرننگ سے طلباء اپنے آپ کو اکتساب میں خودمختار ہو سکتے ہیں۔اس تحقیقی مقالہ میں ڈیجیٹل لرننگ کے دور میں استاد کے کردار کو وسیع طور پر مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مطالعہ کی بنیاد پر اساتذہ کے کردار کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ڈیجیٹل لرننگ:

''ڈیجیٹل لرننگ "ٹیکنالوجی کے ذریعے آسان سیکھنا ہے جو طلباء کو وقت، جگہ، راستے ، رفتار، ٹیکنالوجی ، ڈیجیٹل مواد اور ہدایات پر کنٹرول کا کچھ عناصر فراہم کرتا ہے۔"

وقت: اکتساب اب اسکول کے دن یا تعلیمی سال تک محدود نہیں ہے بلکہ انٹرنیٹ اور انٹرنیٹ تک رسائی کے آلات کے پھیلاؤ نے طلباء کو کسی بھی وقت سیکھنے کی صلاحیت فراہم کی ہے۔

جگہ: کلاس روم کی دیواروں کے اندر سیکھنا اب محدود نہیں رہ گیا بلکہ انٹرنیٹ اور انٹرنیٹ تک رسائی کے آلات کے پھیلاؤ نے طلباء کو کہیں بھی اور ہر جگہ سیکھنے کی صلاحیت فراہم کی ہے۔

راستہ: سیکھنا اب استاد کے ذریعہ استعمال ہونے والی کمرہ

جماعت کی تدریس تک محدود نہیں ہے بلکہ انٹرایکٹو اور موافقت پذیر سافٹ ویئر طلباء کو اپنے انداز میں سیکھنے کی اجازت دیتا ہے، سیکھنے کو ذاتی اور دلچسپ بناتا ہے۔ نئی سیکھنے کی ٹیکنالوجیز ریئل ٹائم ڈیٹا فراہم کرتی ہیں جو اساتذہ کو وہ معلومات فراہم کرتی ہیں جن کی انہیں ہر طالب علم کی منفرد ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہدایات کے ساتھ تال میل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

رفتار: اکتساب اب طلباء کے پورے کلاس روم کی سرگرمیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ انٹرایکٹو اور موافقت پذیر سافٹ ویئر طلباء کو اپنی رفتار سے سیکھنے کی اجازت دیتا ہے، سیکھنے کی ایک ہی سطح کو حاصل کرنے کے لیے اسباق یا مضامین پر کم وقت صرف کرتا ہے۔

ٹیکنالوجی: ڈیجیٹل لرننگ میں ٹیکنالوجی وہ طریقہ کار ہے جو تدریس و اکتساب میں مدد کرتا ہے جو کہ آج کے دور میں تدریسی مواد کو فراہم کرنے میں سہولت پیدا کرتا ہے۔ طلباء کس طرح مواد حاصل کرتے ہیں؟ اس میں انٹرنیٹ تک رسائی اور ہارڈ ویئر شامل ہے، جو کہ انٹرنیٹ تک رسائی کا کوئی بھی آلہ ہوسکتا ہے- ڈیسک ٹاپ، لیپ ٹاپ سے لے کر آئی پیڈ سے اسمارٹ فون تک۔ ٹکنالوجی ٹول ہے، ہدایات نہیں۔

ڈیجیٹل تعلیمی مواد: ڈیجیٹل مواد اعلیٰ معیار کا تعلیمی مواد ہے جو ٹیکنالوجی کے ذریعے فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ وہی ہے جس سے طلباء پڑھتے اور سیکھتے ہیں۔ اس میں نئے دلچسپ، انٹر ایکٹو سافٹ ویئر، کلاسک لٹریچرس، ویڈیو لیکچرز و گیمز تک شامل ہیں۔ یہ محض متن کی پی ڈی ایف یا پاور پوائنٹ پریزنٹیشن نہیں ہے بلکہ یہ جدید دور میں سیکھنے سیکھانے کا ایک وسیع نظریہ ہے۔ آج کے دور میں ڈیجیٹل لرننگ طلبہ سے لے کر عام آدمی سب پر اثر انداز ہے۔ ڈیجیٹل لرننگ کمرہ جماعت سے نکل کر عام آدمی کی ذاتی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔

ہدایات: معلم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ڈیجیٹل لرننگ و ٹیکنالوجی کے وسائل سے روشناس ہوں۔ آج استاد کا کردار بھی ڈیجیٹل ہوگیا ہے جو استاد کے کردار کو بدل سکتی ہے۔ ڈیجیٹل لرننگ کے ساتھ اساتذہ اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ وہ اپنی رہنمائی اور مدد فراہم کرسکیں۔ طلبا کو سیکھنے اور اپنے اکتسابی تسلسل پر رہنے کو یقینی بنانے کے لیے اساتذہ ڈیجیٹل لرننگ میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

قدیم ہندوستان میں اساتذہ فکر کے روحانی عالم بردار مانے جاتے تھے۔ استاد کے بغیر تعلیم ناممکن تھی اور وہ تعلیم کے گرو مانے جاتے تھے۔ شاگرد کا اپنے گرو کے ساتھ بہت روحانی، گہرا اور دوستانہ تعلق تھا۔ تعلیم کے علاوہ بہت سے معاملات میں استاد نے اپنے شاگرد کا ساتھ دیا لیکن رفتہ رفتہ استاد کا کردار بدل کر سہولت کار ہوگیا۔ تعلیمی نظام نے ویدک دور سے لے کر پورے سیکھنے کے عمل میں بہت ترقی کی ہے۔ بلیک بورڈز اور لیکچر کے طریقہ کار کا استعمال کرتے ہوئے اب آہستہ آہستہ ٹیکنالوجی مختلف سمعی و بصری امداد کے ساتھ کمرہ جمات میں داخل ہوگئی جس سے ڈیجیٹل لرننگ میں اکتسابی عمل کا رول متاثر ہونے لگا، لیکن اس سے اساتذہ کو تدریسی

عمل کے معیار کو بڑھانے میں مدد ملی۔ آج کے کمپیوٹر کے دور میں اساتذہ کا کردار بہت بدل گیا ہے، اساتذہ آج سیکھنے کے سفر میں رہنما کے طور پر کام کرتے ہیں اور طالب علم کو خود سے بہترین حاصل کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ آج اساتذہ اپنے طلباء میں کثیر جہتی مہارتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں زندگی کی مہارت اور سافٹ اِسکل دونوں سکھاتے ہیں۔ جو طلبہء کے اکتسابی عمل میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اساتذہ جدید تدریسی طریقہ کار کو اپنانے کی مسلسل کوشش کرتے ہیں اور ان کی بنیادی توجہ ہر طالب علم کے لیے سیکھنے کو مزید پر لطف اور دلچسپ بنانا ہوتا ہے جس کے ذریعہ متعدد ذہانتوں کو ابھارا جاسکتا ہے۔ چونکہ تعلیم محض نوکری حاصل کرنے کی سیڑھی نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہے۔

کرونا کے دور میں ڈیجیٹل تعلیم کی نوعیت:

کرونا دور میں تعلیم بڑی حد تک آن لائن ہوگئی اور آن لائن کے ذریعہ ہی تدریسی عمل کو انجام دیا جانے لگا۔ چونکہ کورونا کی وجہ سے لاک ڈاؤن کے اوقات میں تعلیم کے لئے ڈیجیٹل وسائل جیسے زوم Z o o m، واٹس ایپ Whatsapp اور گوگل کلاس رومز Google Classroom کا استعمال کافی حد تک کیا جانے لگا۔ کورونا دور کو آن لائن لرننگ سے موسوم کیا جانے لگا۔ استاد آن لائن لرننگ سے طلباء کو گھر میں محفوظ اور صحت مند رکھ کر نصاب کے ساتھ تدریسی عمل کو انجام دینے لگے۔ استاد آن لائن لرننگ سے کورونا دور میں سبھی طلباء کو ہم آہنگ رکھنے و اکتسابی عمل کو پورا کرنے میں لگے رہتے تھے۔ ای لرننگ E-Leraning کی بات کرے تو کچھ اساتذہ مختلف ورچوئل پلیٹ فارمز Virtual Platform سے واقف ہی نہیں تھے جس سے تدریسی عمل کا مقاصد پورا ہو سکے، چونکہ اساتذہ پڑھانے کے جذبے سے سرشار ہیں، اس کے برعکس انہوں نے خود کو ڈیجیٹل کلاس روم کے لیے تیار کیا اور تمام ضروری ٹولز Tools سے واقف اور انٹرنیٹ سے آگاہ ہونے کی کوشش کی۔ ان کاوشوں سے انہیں ٹیکنالوجی کے استعمال میں پر اعتماد حاصل ہوا۔ یہ کورونا وبائی مرض کی دین ہے۔ ڈیجیٹل کلاسز Digital Classes میں کچھ چیلنجز ہیں جیسے طلباء کی توجہ حاصل کرنا، آن لائن کلاسز میں دلچسپی لینا، تدریس کے آن لائن طریقے سے واقفیت اور اُس میں تخلیقی صلاحیت کی کمی وغیرہ۔ سبھی طلباء کے پاس ڈیجیٹل لرننگ سے متعلق وسائل کی کمی، انٹرنیٹ کی رسائی، والدین کی ڈیجیٹل لرننگ سے ناواقفیت و معاشی حالات بھی اہم چنوتیاں ہیں۔ ڈیجیٹل لرننگ کے دور میں تعلیم تک سب کی پہنچ ہونا بھی ایک اہم مسئلہ ہے جو کہ تعلیم میں مساوات پر سوال پیدا کرتا ہے۔

ڈیجیٹل لرننگ ایک بہترین تدریس کا ذریعہ ہے اگر اسے مؤثر طریقے سے استعمال کیا جائے۔ بہت ساری تحقیق سے یہ بات واضح ہے کہ آن لائن Online اکتساب سے معلومات کو حاصل کرنے میں کم وقت لگتا ہے۔ قومی تعلیمی

پالیسی-2020 ڈیجیٹل تعلیم کا منظم نظریہ پیش کرتی ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی-2020 کی سفارشات میں آن لائن تعلیم کو بھی معیاری تعلیم بنانے پر زور دیا گیا جس کی پہنچ سبھی تک آسان ہو سکے۔ قومی تعلیمی پالیسی کے تحت ایک نیا خودمختار ادارہ National Education Technology Forum (NETF) قائم کیا جائے گا جو تعلیم کی تمام سطحوں پر ڈیجیٹل طریقہ کار کو اپنانے کے طور طریقے بنائے گا۔ یہ خاص طور پر کلاس روم کے طریقے اور اداروں کے لیے اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت کی مواد اور کمرہ جمات کی تدریس و اکتساب کو ڈیجیٹل لرننگ سے جوڑے گا۔ کورونا دور میں اساتذہ نئے ڈیجیٹل اسباق کا چیلنج کے ساتھ درس وتدریس میں استعمال کر چکے ہیں اور انہوں نے ہر صورت حال سے ہم آہنگ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ دنیا کے لیے بھلے ہی ہم صرف استاد ہوں، لیکن اپنے طلبہ کے لیے ہم مثال ہیں۔

اب ہندوستان میں بہت سارے عام زندگی کے کام ڈیجیٹل پر منحصر ہو چکے ہیں۔ ماہرین تعلیم سے پوری دنیا کے طلباء تک ڈیجیٹل تعلیم پہنچانے و تجربہ کرنے کو لازمی بنا دیا ہے۔ اساتذہ نے ہمیشہ تصورات کو آسان بنانے کے لیے ڈیجیٹل تدریس کے تخلیقی طریقہ کار کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہی اساتذہ کو اب ایک نئے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا کہ آن لائن تدریس میں مزید تخلیقی کیسے بنایا جائے؟ تعلیمی نظام مسلسل سیکھنے والوں کے لیے بہتر اور اعلیٰ معیار کی تعلیم کا مطالبہ کرتا ہے۔ دنیا کی بدلتی ہوئی توقعات کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے کردار مزید پیچیدہ اور متقاضی ہوتے جا رہے ہیں۔ دنیا کی ٹیکنالوجی کی سمت بڑھنے کے ساتھ اساتذہ سے ان کی تدریسی توقعات تبدیل ہو رہی ہیں۔ اس لئے آج ڈیجیٹل لرننگ کے دور میں استاد کا کردار بھی تیزی سے بدل رہا ہے۔ اب استاد کو درس وتدریس کے بدلتے ہوئے ڈیجیٹل طریقوں سے اپنے آپ کو ہمیشہ تیار رکھنا پڑے گا۔ آج ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اسمارٹ فون نے لرننگ کو بہت آسان اور سہل بنا دیا ہے۔ اب لرننگ کا دور سمعی بصری سے ہوتا ہوا کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے ترقی پاتا ہوا موبائل لرننگ تک پہنچ گیا ہے۔

تدریسی اکتساب کے عمل میں ایک مثالی تبدیلی ہے اور یہ تبدیلی ناگزیر ہے۔ چاہے وہ آن لائن کلاسز ہوں یا آف لائن کلاسز۔ اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ٹیکنالوجی پر مبنی اپنی تدریس کو بہتر طریقے سے انجام دیں۔ ڈیجیٹل اکتساب دنیا میں اساتذہ کے بدلتے ہوئے کردار کو دیکھنے کے لیے بہت سے تناظر ہیں۔ طلباء کے متنوع گروپ اور ان کے مطالبات کی وجہ سے اساتذہ کو درپیش مختلف چیلنجز کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ڈیجیٹل دور نے اساتذہ کے مختلف کردار ادا کرنے کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ ڈیجیٹل تعلیم نے اساتذہ کو ایک پلیٹ فارم فراہم کیا ہے تاکہ سیکھنے والوں کو معیاری تعلیم فراہم ہو سکے۔ نیٹ ورکنگ نے انہیں طلباء کے ساتھ ساتھ ماہرین کے ایک بڑے گروپ تک پہنچنے کے لیے ایک

وسیع نمائش فراہم کی ہے۔ چیلنجز اور مواقع نے اساتذہ کے لیے نصاب کی ڈیزائننگ اور ڈیلیوری کے حوالے سے تجربہ کرنے کی راہیں بھی کھول دی ہیں۔ سماجی مسائل کے ساتھ اپ ڈیٹ رہتے ہوئے موجودہ معاملات سے بخوبی طور پر جڑی ہوئی ہے۔ اساتذہ ایک ہی پلیٹ فارم پر جتنا زیادہ طلباء کے ساتھ تال میل کرسکیں گے، اس سے اساتذہ کا طلباء کے ساتھ رابطہ زیادہ متاثر ہوگا۔ اساتذہ کے کردار کو انسٹرکٹر سے بدل کر سہولت کار بنا دیا گیا ہے۔ وہ علم حاصل کرنے والوں کو حوصلہ افزائی، سیکھنے والوں کے رویوں کو بدلنے کے لیے ذمہ دار مانے جاتے رہے ہیں۔ پہلے کے مطابق طلبہ اب کسی چھوٹی جگہ تک محدود نہیں رہے۔ پوری دنیا ان کے علم حاصل کرنے کے لیے کھلی ہوئی ہے جو اساتذہ کو اپنی تدریس کے نئے اور بہتر طریقے اختیار کرنے کے لیے زیادہ مجبور کر رہی ہے۔ علم جس طرح لامحدود ہے ٹھیک اُسی طرح ڈیجیٹل دور میں ایک استاد جو کردار ادا کرسکتا ہے وہ بھی لامحدود ہے۔

اساتذہ طلباء کے ساتھ ساتھ موجودہ دور سے بھی آگے رہیں تاکہ تمام شعبوں میں تازہ ترین اپ ڈیٹس کو کمرہ جماعت میں پہنچایا جاسکے۔ لیکن کیا ہوگا؟ اگر کمرہ جماعت کا وجود ختم ہوجائے۔ شاید یہی وہ صورتحال ہے جس میں ہمیں کورونا نے متاثر کیا۔ یہاں خاص بات یہ ہے کہ استاد کو نہ صرف مضمون کے بارے میں سیکھنا بلکہ کمرہ جماعت کے بغیر اُسے کیسے پڑھانا ہے بھی سیکھنا ہوگا۔ ایک عام سوال یہ ہے کہ آن لائن ٹولز کو کیسے ہینڈل کیا جائے؟ جو اساتذہ کو آن لائن کمرہ جماعت اور روایتی کمرہ جماعت میں مدد دیتے ہوں۔ اساتذہ کو اب یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ یہ سافٹ ویئر کیسے کام کرتے ہیں؟ جیسے آن لائن کلاس کو کیسے Schedule کرنا، ویڈیوز اور تدریسی مواد کو کس طرح Share کرتے ہیں وغیرہ۔ کمرہ جماعت کی تدریس کے معاملے میں، استاد اچھی طرح سے جانتے ہیں، لیکن ڈیجیٹل طور پر، طلباء توقع سے کہیں زیادہ جان سکتے ہیں۔ استاد نے ڈیجیٹل لرننگ کے متعلق انفرادی طور پر بہت کچھ سیکھا ہے اور آن لائن ذریعہ سے استاد اور طالب علم کے درمیانی فاصلہ کو کم کیا ہے۔ اساتذہ ہر ایک کی زندگی میں ایک ناگزیر کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ سکھاتے ہیں، بااختیار بناتے ہیں، حقیقی زندگی سے تعلق جوڑتے ہیں، حوصلہ افزائی کرتے ہیں، خود ترقی کے پورے سفر میں سہولت فراہم کرتے ہیں، زندگی کو بدلنے اور بہترین انداز میں زندگی سے سامنا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ عالمگیریت کے اس دور میں ایک مبلغ سے سیکھنے والے کے سماجی اور جذباتی رویے کے مینیجر کے کردار اور شخصیت کو عزت دینے کے لیے استاد سے لے کر ایک سرپرست تک میں ایک مثالی تبدیلی پائی گئی ہے۔ ڈیجیٹل دور میں استاد کا کردار اور بھی پیچیدہ ہوگیا ہے۔

علم میں بڑے انقلاب کے لیے عوامی مانگ میں اضافے کے ساتھ، ایک استاد کو ڈیجیٹل ماحول میں تیز رفتار سے سیکھنے والا ہونا چاہیے۔ لیکن وہ سُست رفتار سے سیکھتا ہے تو طلباء کو ترغیب نہیں دے پائیگا۔ ٹیکنالوجی اساتذہ کو دستیاب

تعلیم و روزگار

وسیع وسائل سے اپنے علم کو اپ گریڈ کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ یہ اساتذہ کو باہمی تعاون سے پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں بھی مدد کرتی ہے۔ ٹیکنالوجی معاشرہ میں طالب علم کو بدلتے ڈیجیٹل ماحول کے حساب سے تیار کرتی ہے۔ ڈیجیٹل لرننگ میں مختلف پلیٹ فارمز کا استعمال کرتے ہوئے بغیر کسی تاخیر کے اپنے طلباء کو اکتسابی ماحول میں جوابات دینے کے لیے بھی تیار کیا جاتا ہے۔ ٹیکنالوجی اساتذہ کو اپنے اسباق کے مواد کو درس و تدریس کے لیے بہتر بنانے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ ڈیجیٹل لرننگ میں طالب علم کو کسی موضوع کے لیے مختلف طریقوں سے دلچسپی پیدا کرتی ہے۔ اس نئے تناظر میں استاد کو انٹرنیٹ پر دستیاب معلومات میں معیار اور مقدار دونوں کے طرز پر کام کرنا ہوگا۔ ماہرین تعلیم کے لیے ڈیجیٹلائزیشن کی طرف بڑھنا آسان سفر نہیں ہے۔ آن لائن ڈیلیوری کی کارکردگی کو بڑھانے کے لیے معلمین کو مختلف تکنیکی صلاحیتوں کو بھی حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

ڈیجیٹل لرننگ کے دور میں استاد کے درپیش چنوتیاں:

ڈیجیٹل لرننگ سے متعلق سب سے بڑی چنوتی یہ ہے کہ وہ پیشہ ورانہ طور پر تربیت یافتہ نہیں ہے۔ تعلیمی اداروں میں بھی ڈیجیٹل لرننگ سے متعلق سہولیات فراہم نہیں ہیں۔ انٹرنیٹ کی پہنچ بھی سبھی تک نہیں ہو پائی ہے۔ ڈیجیٹل لرننگ سے دیہی و غریب آبادی تعلیم سے کوسو دور ہو رہی ہے۔ ڈیجیٹل لرننگ کے لئے ایک مستقل، ہائی سپیڈ انٹرنیٹ کنیکشن کی اہم ضرورت پڑتی ہے اس کے بنا آن لائن تعلیم کے مقاصد کو حوصول نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ڈیجیٹل لرننگ کے لئے تدریسی مواد، مادری زبان میں تعلیم، تعلیمی انتظامات و تعلیم میں شرکت کے لئے اچھی پالیسی کی کمی ہے۔ ڈیجیٹل لرننگ سے طلباء کا سماجیانہ اس طرح سے نہیں ہو پاتا جس طرح آف لائن ذریعہ تعلیم میں ہوتا تھا۔ ڈیجیٹل تعلیم میں سماجی مسائل و مددوں کو ہم نفسیاتی طور پر طلبہ تک نہیں پہنچا پاتے۔ اس طرح ڈیجیٹل تعلیم میں طلبہ کا ذہنی، نفسیاتی اور سماجی ترقی و فروغ فاصلہ کی وجہ سے اثر اندازی پر نہیں کر پاتے۔

ڈیجیٹل لرننگ کے دور میں استاد کا کردار:

☆ طلباء کے لیے محفوظ قابل استعمال آن لائن وسائل کو شامل کرنے کے لیے تحقیق کی مہارت۔

☆ ملٹی میڈیا اور سافٹ ویئر کا استعمال کرتے ہوئے موثر آن لائن پریزنٹیشن بنانے کی مہارت۔

☆ تمام اسٹیک ہولڈرز کے ساتھ مختلف مواصلات کے لیے ڈیجیٹل ٹولز استعمال کرنے کی مہارت حاصل کرنا۔

☆ ڈیجیٹل درس و تدریس کے طریقے و دستاویزات تیار کرنے، ان کا نظم کرنے، ترتیب دینے اور تجزیہ کرنے کے لیے انتظامی مہارتیں۔

☆ روایتی تعلیم سے ڈیجیٹلائزیشن کے نئے معمول کی طرف پوری تبدیلی کو آسان بنانے کے لیے، پالیسی سازوں کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔

☆ اساتذہ اسکول اور اسکول کے بعد عملی دنیا میں بھی اپنے طلباء کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ڈیجیٹل لرننگ میں بھی یہ کردار مسلسل طور پر برقرار رہنا چاہئے۔

☆ علم بانٹنا،تعلیم دینا اور زندگی کے بارے میں سکھانا استاد کی بنیادی ذمہ داری ہے۔عام طور پر،اساتذہ کا مطلب طلباء کو مخصوص نصاب پڑھانا اور مخصوص نصاب کے بارے میں علم فراہم کرنا ہوتا ہے۔اساتذا اس بات کو یقینی بنائیں کہ طلباء کلاس روم میں،آن لائن ٹیچنگ،ای لرننگ میں اپنے آپ کو ڈھال سکیں۔اساتذہ کو ڈیجیٹل لرننگ میں بھی روایتی تعلیم کے بنیادی فرائض ادا کرنے چاہئیں۔

☆ ہر بچہ مختلف ہوتا ہے، اس لیے انفرادی طور پر ان کی شخصیت بھی الگ ہوتی ہے۔ڈیجیٹل لرننگ میں بھی طلباء کے سیکھنے میں روایتی تعلیم کے مسائل دیکھے جاسکتے ہیں۔استاد کو ڈیجیٹل لرننگ میں نفساتی ماحول کو سمجھ کر طلباء کی شخصیت کو نکھارنا ہوگا۔استاد کی یہ ذمہ داری ڈیجیٹل دور میں بھی بنتی ہے کہ وہ طلباء کو اس طرح سے پڑھائیں کہ وہ سیکھنے میں لطف اندوز ہوں اور وہ سیکھنے پر توجہ دیں۔اس لئے استاد کو روایتی تعلیم کی طرح ڈیجیٹل لرننگ میں بھی تحقیق کر کے سیکھنے کے نئے طور طریقے اپنانے چاہیے۔

☆ طلباء حقیقی زندگی کی مثالوں کو آسانی سے اور تیزی سے سمجھتے ہیں۔ایک اچھے استاد کو پڑھاتے ہوئے ڈیجیٹل لرننگ میں بھی مختلف مضامین کو حقیقی زندگی کے حالات سے جوڑنا چاہیے جس سے موضوعات کو قابل فہم بنایا جا سکے۔

ڈیجیٹل لرننگ میں بھی استاد کو طالب علم کی اکتسابی ضرورتوں کو سمجھ کر حکمتِ عملی کو انجام دینا ہوگا۔حقیقی زندگی کی مثالوں کی مدد سے مشکل موضوعات کا بھی مظاہرہ کرنا اساتذہ اور طلباء کے لیے بھی آسان بناتا ہے۔اس لئے آج استاد کے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا وہ ڈیجیٹل لرننگ میں حقیقی زندگی کی مثالوں کو دلچسپی سے پیش کر پائے گا۔

☆ ڈیجیٹل لرننگ میں بھی استاد کو طلباء کو حوصلہ افضائی کرنی چاہیے۔ڈیجیٹل لرننگ درس وتدریس کے جدید طور طریقوں سے طلباء میں دلچسپی پیدا کرنی چاہئے۔

☆ ''کسی قوم کی مستقبل کی ترقی صحیح معنوں میں اچھے اساتذہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے''۔چونکہ وہ تعلیم فراہم کرتے ہیں اور طلباء کو قوم کا مستقبل بننے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ایک استاد کا کردار بہت اہم ہوتا ہے کیونکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ افراد اور قوم کے حالات کا تجزیہ کرنے کی سمجھ بچوں میں پیدا کرتے ہیں۔ڈیجیٹل لرننگ میں بھی استاد کو سماجی، معاشی، سیاسی، علاقائی اور نفسیاتی ماحول کو سمجھ کر طلباء کو پڑھانا ہوگا۔

☆ ڈیجیٹل لرننگ میں استاد کا کردار روایتی تعلیم سے بھی بڑھ کر ہے۔استاد ہی اپنے طلباء کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ تعلیم کے میدان میں کس طرح سے آگے بڑھ سکتا ہے۔استاد طلباء کو خود اعتماد دیتا ہے جس سے وہ اکتساب کے مسائل کو حل کر کے آگے بڑھ سکے۔

نتیجہ: اس طرح آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ روایتی تعلیم کی طرح ڈیجیٹل لرننگ کے دور میں استاد کا کردار اور بھی زیادہ

بڑھ گیا ہے۔ڈیجیٹل لرننگ کو سائنسی اور منظم طور طریقوں سے منعقد کیا جائے تو اس کی پہنچ واثر اندازی سبھی طلباء تک ہوسکتی ہے۔ڈیجیٹل لرننگ کے لئے ہمیں ہندوستان کی تہذیب وثقافت کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔ہندوستان کی مختلف زبانوں کو ذہن میں رکھ کر بھی انتظامات کرنے پڑیں گے۔استاد اپنی ذمہ داریوں کو ڈیجیٹل تربیت سے اچھی طرح نبھا سکے گا۔ایک طرح سے آج استاد کو ڈیجیٹل پیڈاگوجی پیشہ ورانہ تعلیم وتربیت سے روشناش ہونا پڑے گا۔

حوالہ جات:

انسانی وسائل ترقی وزارت (1986) قومی تعلیمی پالیسی-1986،نئی دہلی بھارت سرکار۔
انسانی وسائل ترقی وزارت (1990) پروگرام آف ایکشن-1992،نئی دہلی بھارت سرکار۔
ڈاکٹر اشوینی (2021)،ڈیجیٹل تعلیم،قومی تعلیمی پالیسی کے تناظر میں ایک تنقیدی مطالعہ۔
Ministry of Education, GOI,
https://www.education.gov.in/en
https://gosa.georgia.gov/about-us/what-digital-learning
https://www.digitalclassworld.com/blog/role-of-teacher/The Role of Teachers in Education
Deepa Ayachit,

☆☆☆

روش انجم، ریسرچ اسکالر شعبہ تعلیم وتربیت و
ڈاکٹر اشوینی، اسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ تعلیم وتربیت
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
گچی باؤلی-حیدرآباد500032

ترا دل تو ہے صنم آشنا

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئنہ ساز میں

دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایت سوز میں نہ مری حدیث گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

(علامہ اقبالؒ)

ہندوستان کی عصری یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے

اسلامک اسٹڈیز کا مطلب ہے اسلام کا تاریخی مطالعہ۔اس مطالعہ میں مسلم حکومتوں کی تاریخ، ان کا عروج و زوال، ان حکومتوں کا نظم ونسق، اسلامی تہذیب و ثقافت، اسلامی علوم، فنون لطیفہ وفن تعمیر، اسلامی افکار ونظریات، تصوف وکلام، مسلم فرقے، مسلم تحریکات و ادارے، سب شامل ہیں۔ اسلامک اسٹڈیز یوں تو ایک مضمون ہے لیکن درحقیقت یہ اپنے اندر بہت سے مضامین کو سموئے ہوئے ہے اور یہ متعدد مضامین کا مجموعہ ہے۔ اسلامک اسٹڈیز ایک ہمہ گیر اور وسیع اصطلاح ہے جس میں متعدد چیزیں شامل ہیں۔ اسلام کا مطالعہ دور اول سے ہی شروع ہوگیا تھا، اس کے لیے حضرت ابوذر غفاریؓ کا قبول اسلام سے پہلے اسلام کے بارے میں تجسس اور اپنے بھائی کو بھیج کر تفتیش اور پھر خود حاضر ہوکر اس کی تحقیق کرنا اور حضرت عبداللہ ابن سلامؓ کا اپنے سابقہ مذہب یہودیت کو چھوڑ کر اسلام کے دامن میں آنا، بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ دسویں صدی میں مسلم اندلس میں اس مطالعہ میں باقاعدگی اور تنظیم آئی، صلیبی جنگوں کے دوران اور اس کے بعد اس میں تیزی آئی اور مزید نظم وضبط پیدا ہوا لیکن اسلام کو ایک سبجکٹ اور موضوع کی حیثیت سے سمجھنے کا آغاز سب سے پہلے انیسویں صدی میں یورپ میں ہوا۔ اس کے بعد بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندوستان میں بھی اسلامک اسٹڈیز کا ایک سبجکٹ کے طور پر آغاز ہوا۔ چنانچہ اس جانب پیش قدمی کرتے ہوئے سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کو ایک بہ حیثیت سبجکٹ منظور کیا گیا اور بی اے اور ایم اے میں اسلامک اسٹڈیز کو بطور ایک سبجکٹ متعارف کرایا گیا اور باقاعدہ طور پر ایک مضمون نصاب میں شامل کیا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک بیسیوں یونیورسٹیز ہیں جہاں اسلامک اسٹڈیز داخل نصاب ہے اور دسیوں یونیورسٹیز ہیں جہاں باقاعدہ اسلامک اسٹڈیز کے شعبے قائم ہیں اور تدریس کے ساتھ ساتھ اسلامک اسٹڈیز کے اہم اور جدید ومعاصر مسائل پر ریسرچ وتحقیق کا کام ہورہا ہے۔ ذیل کی سطروں میں ہندوستان کی چند اہم یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں کا تعارف اور مختصر تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔

1920 میں جب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا درجہ ملا تو اسی سال اسلامک اسٹڈیز کو بی اے اور ایم اے کی سطح پر یونیورسٹی میں تسلیم کیا گیا، لیکن اسلامک اسٹڈیز کی تدریس کا باقاعدہ آغاز 1951 میں ہوا۔ اس وقت اس کو شعبہ عربی کے تحت رکھا گیا۔ 1954 میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم کیا گیا جس کے دائرہ کار میں صرف ریسرچ وتحقیق کرنا تھا، اسلامک اسٹڈیز کی تدریس شامل نہیں کی گئی۔ 1968-1969 میں اسلامک اسٹڈیز کے مضامین کی

تدریس شعبہ عربی سے الگ کر کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے حوالے کی گئی۔ شعبہ کے قیام سے اب تک 116 ریسرچ اسکالرس کو پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی گئیں۔ اس وقت شعبہ میں دس مستقل اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور ان کی نگرانی میں ریسرچ اسکالر اپنے تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں۔

جامعہ ہمدرد کا شعبہ اسلامک اسٹڈیز قدیم ترین شعبوں میں سے ایک ہے، جامعہ ہمدرد کے قیام سے بہت پہلے اس کو 1963 میں، حکیم عبدالحمید نے اسلامی ثقافت اور تہذیب کے مطالعہ کو فروغ دینے، خاص طور پر ہندوستانی معاشرے اور ثقافت میں اسلامی ثقافت وتہذیب کی شراکت کو فروغ دینے کے مقصد سے ''انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز'' کے نام سے قائم کیا تھا۔ اور اسی شعبہ نے بعد میں 1989 میں جامعہ ہمدرد کے قیام کے لیے بنیاد فراہم کی۔ یہ شعبہ تحقیقی اور تدریسی سرگرمیوں میں سرگرم عمل ہے۔ یہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے تین پروگرام پیش کرتا ہے: بی اے (آنرس)، ایم اے اور پی ایچ۔ڈی پروگرام۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصاب میں اسلامک اسٹڈیز اسی دن سے شامل ہے جب 29/اکتوبر 1920 کو علی گڑھ میں اس جامعہ کا آغاز ہوا تھا۔ 1975 میں اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز کے نام سے ایک مشترکہ شعبہ قائم کیا گیا، بعد میں 1988 میں اسلامک اسٹڈیز کو ایک مستقل اور بااختیار شعبہ کی حیثیت دی گئی۔ اس شعبہ میں بی اے آنرس اور ایم اے کے علاوہ بی اے کے طلبہ کے لیے اسلامیات اور ہندوستانی مذاہب اور تہذیب کے عنوان سے دو لازمی پیپرس بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ اس وقت شعبہ میں 9 مستقل اساتذہ تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شعبہ کے قیام سے اب تک یہاں تقریباً 90 پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں تفویض کی جاچکی ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ اسلامک کا قیام 1965 میں جرمنی کے وزیٹنگ پروفیسر ہنس کروس کی سرپرستی میں عمل میں آیا۔ جنوبی ہندوستان میں یہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی تدریس اور تحقیق کا سب سے بڑا مرکز ہے، اس شعبہ نے 2015 میں گولڈن جوبلی تقریب بھی منائی، جس میں کانفرس، سمینار اور لکچرز کا انعقاد بھی کیا گیا۔ اس شعبہ میں اس وقت صرف دو اساتذہ تدریسی خدمات پر مامور ہیں، شعبہ کے قیام سے اب تک یہاں صرف 26 پی ایچ۔ڈی کے مقالات لکھے گئے، شعبہ کے قیام سے اب تک کی مدت کو اگر ہم دیکھیں تو مقالوں کی یہ تعداد اس طویل مدت کی بہ نسبت انتہائی قلیل ہے۔ اس کے علاوہ اس شعبہ میں مزید اساتذہ کی سخت ضرورت ہے، کیوں کہ اساتذہ کی کمی کی وجہ سے یہاں ان دنوں پی ایچ۔ڈی کا کورس دستیاب نہیں ہے۔ ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کا ایک قدیم شعبہ اور اس میدان میں اہم خدمات انجام دینے والا شعبہ ایسا لگتا ہے جیسے ان دنوں بڑی کسمپرسی کے عالم میں ہے۔ اس جانب ارباب حل وعقد اور اصحاب انتظام وانصرام کو فوری توجہ مبذول کرنے کی ضرورت

ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس شعبہ کو ایک غیر فعال یا غیر ضروری کہہ کر اسے بند کر دیا جائے۔

کشمیر یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ ''شاہ حمدان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز'' کے نام سے 1988ء میں قائم ہوا۔ اس شعبے میں تین کورسس دستیاب ہیں: 1۔ ایم اے اسلامک اسٹڈیز (دو سال)، 2۔ پی ایچ۔ ڈی (دوسال)، 3۔ انٹی گریٹیڈ ایم۔ فل/ پی ایچ۔ڈی (تین سال) اس شعبے میں دو پرمانٹ اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سب سے پہلی پی ایچ۔ڈی 1993 میں جمع کی گئی، اس کے بعد سے اب تک یہاں 50 پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں اوارڈ ہو چکی ہیں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کا قیام 2013 میں عمل میں آیا۔ اس شعبہ میں ایم اے اور پی ایچ۔ڈی پروگراموں کے علاوہ ایک ڈپلوما کورس بھی دستیاب ہے۔ شعبہ کی جانب سے انڈر گریجویٹ پروگراموں کے لیے ایک بنیادی کورس اور ایک لازمی کورس کے طور پر بھی اسلامیات کی تدریس فراہم ہے۔ یہ شعبہ نان سی جی پی اے پرچہ کے طور پر اسکول بیک گراؤنڈ سے آنے والے طلبا کے لیے ''اسلامیات'' کا پرچہ پیش کرتا ہے اور مدرسہ بیک گراؤنڈ سے آنے والے طلبا کے لیے ''دنیا کے بڑے مذاہب'' پرچہ پیش کرتا ہے۔ یہاں چار پرمانٹ اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اب تک یہاں صرف ایک پی ایچ۔ڈی ہو سکی ہے۔

عالیہ یونیورسٹی کلکتہ، جس کا پرانا نام مدرسہ عالیہ ہے، اس کی بنیاد 1780 میں رکھی گئی اور 2008 میں اس کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا۔ اس یونیورسٹی میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کا قیام 2017 میں عمل میں آیا، یہ شعبہ ہندوستان میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں میں بہت ہی نیا شعبہ ہے۔ شعبہ میں اس وقت تین سالہ بی اے (آنرز) اور دو سالہ ایم اے اسلامک اسٹڈیز کے کورسس فراہم کئے جاتے ہیں، اس شعبہ میں ابھی ریسرچ و تحقیق کا آغاز نہیں ہوا ہے۔ شعبہ میں دو پرمانٹ اسسٹنٹ پروفیسر تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

بی۔ایس۔عبدالرحمن کریسنٹ انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی جس کو بی۔ایس۔عبدالرحمن یونیورسٹی بھی کہا جاتا ہے۔ اس یونیورسٹی کا قیام ڈاکٹر بی۔ایس۔ کے نام پر 1984 میں عمل میں آیا۔ یہ ایک پرائیویٹ یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ ''اسکول آف عربک اینڈ اسلامک اسٹڈیز'' کے نام سے 2009 میں قائم ہوا۔ یہاں عربک اینڈ اسلامک اسٹڈیز میں یو جی، پی جی اور پی ایچ۔ڈی تینوں پروگرام فراہم کیے جاتے ہیں۔

اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، اونتی پورہ، جموں اینڈ کشمیر کا قیام 2005 میں عمل میں آیا اور 2006 میں یہاں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ قائم ہوا۔ اس شعبے میں اسلامک اسٹڈیز کے دو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں: ایم۔اے اسلامک اسٹڈیز اور پی ایچ۔ڈی یہاں 4 پرمانٹ

تعلیم و روزگار

اور 3 عارضی اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اب تک یہاں 5 پی ایچ۔ڈی مکمل ہوچکی اور 7 ایم۔فل اوارڈ ہو چکے ہیں۔

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری جموں و کشمیر 2005 میں معرض وجود میں آئی۔ اور اسی وقت یونیورسٹی میں اسکول آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ لنگویجز کے تحت ایک شعبہ ''ڈپارٹمنٹ آف عربک'' کے نام سے قائم کیا گیا جس کے تحت تین سبجکٹس کے پروگرامس پیش کیے جاتے ہیں: ایک تو خود عربی کا پروگرام، دوسرا اسلامک اسٹڈیز کا پروگرام اور تیسرا اردو کا پروگرام۔ اسلامک اسٹڈیز کے پروگرام کا آغاز 2017 میں ہوا۔ اس میں ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔

سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کا قیام 2009 میں عمل میں آیا۔ اس یونیورسٹی میں ریلیجس اسٹڈیز کا شعبہ 2015 میں قائم کیا گیا۔ یہ شعبہ تقابلی مذہب اور اسلامک اسلدیز میں ماسٹرز پروگرام پیش کرتا ہے۔ ماسٹرز پروگرام کے علاوہ شعبہ ابھرتے ہوئے اسکالرز کے لیے تحقیقی پروگرام بھی پیش کرتا ہے۔ اس وقت ڈپارٹمنٹ میں چار پرمانٹ اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا مظہرالحق عربک اینڈ پرشین یونیورسٹی، پٹنہ، کا قیام 1998 میں عمل میں آیا، لیکن اس میں داخلوں اور تعلیمی سیشن کا آغاز 2008 سے ہوا۔ یہاں بھی اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ قائم ہے، اس وقت یہاں 3 پرمانٹ اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

محمد علی جوہر یونیورسٹی، رام پور یوپی کا قیام 2006 میں عمل میں آیا۔ اس یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ رسمی طور پر تو قائم ہوچکا ہے، لیکن ابھی تک اس میں تعلیم کا آغاز نہیں ہوا ہے۔

ان کے علاوہ ہندوستان میں کچھ اور اہم یونیورسٹیز ہیں جہاں اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم ہوتی ہے ان میں چند اہم نام یہ ہیں:

وسوابھارتی یونیورسٹی شانتی نکیتن بنگال جسے مشہور فلسفی روندر ناتھ ٹیگور نے قائم کی تھی۔ یہ یونیورسٹی اپنے بی اے کے طلبہ کو ایک اختیاری سبجکٹ کے طور پر اسلامک اسٹڈیز فراہم کرتی ہے۔ ساتھ ہی اسلامی فلسفہ کو خصوصی اہمیت دیتی ہے۔ پٹیالہ کی پنجاب یونیورسٹی نے سکھوں کے آخری گرو گرو گوبند سنگھ کے نام پر ریلیجس اسٹڈی کے لئے 1969 میں ایک تدریسی اور تحقیقی شعبہ قائم کیا۔ اس شعبہ میں ریلیجس اسٹڈی میں M.A, M.LITT اور پی ایچ۔ڈی کی ڈگریوں کے لئے طلبہ کو بدھ مت، سکھ مت اور عیسائیت کے ساتھ ساتھ اسلام کا بھی مطالعہ کرایا جاتا ہے، یہ شعبہ ایک سالانہ مجلّہ The Journal of Religious Studies کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اسلامک اسٹڈیز اور تقابل ادیان (Comparative Religion) کے میدان میں کچھ تحقیقی مونوگرافس بھی جاری کرتا ہے۔ ریاست پنجاب اسلامک اسٹڈیز کے میدان میں اپنی تعلیمی دلچسپی کا

اظہار کرتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر چنڈی گڑھ کی The University of Panjab نے عظیم مسلمان صوفی بزرگ شیخ فرید الدین شکر گنج کے نام پر ایک چیئر قائم کی۔ گرونانک دیو یونیورسٹی امرتسر نے حضرت میاں میر چیئر آف ریلیجس اسٹڈیز قائم کیا۔ یہ سب چیئرس خاص طور پر اسلامی تصوف اور ہندوستان میں اس کے عمومی اثرات اور پنجاب میں خصوصی اثرات کے مطالعہ سے وابستہ ہے۔ مدراس یونیورسٹی میں بھی جسٹس بشیر احمد سعید سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز یونیورسٹی آف مدراس میں ساوتھ انڈین ایجوکیشنل ٹرسٹ کی گرانٹ سے مرحوم جسٹس بشیر احمد سعید کی پہل پر قائم کیا گیا تھا، جو ایک عظیم انسان تھے، جنہوں نے باہمی افہام وتفہیم کے فروغ کے ذریعے ہم آہنگی کو فروغ دینے کی ضرورت کو سمجھا۔ یہ سنٹر تمل ناڈو میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے جو 2002 2002 میں معرض وجود میں آیا۔ یہاں صرف ایک استاد ہیں جو اسسٹنٹ پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔ یہاں اسلامک اسٹڈیز کے صرف دو پروگرام دستیاب ہیں۔ ایک ایم اے اسلامک اسٹڈیز، دوسرا ایم فل۔

یہ ہندوستان کی چند عصری یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں کا تعارف تھا۔ ہندوستان میں سرکاری وغیر سرکاری یونیورسٹیوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔ ان ایک ہزار یونیورسٹیوں میں سے اسلامک اسٹڈیز کے شعبے بیس سے بھی کم یونیورسٹیوں میں موجود ہیں۔ یہ تعداد انتہائی قلیل ہے۔ یہ قلیل تعداد ہندوستان کی عصری یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے ناگفتہ بہ حالات کی غماز ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ مزید یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے قائم کئے جائیں، تاکہ اسلامک اسٹڈیز کے سبجکٹ کو فروغ ملے اور اس کے اسکالرز کے لئے وسیع مواقع فراہم ہوں۔

☆☆☆

مفتی محمد صلاح الدین ایوبی
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد
9394717576:Mob

گدھ اور چیل

ایک گدھ نے چیل سے کہا کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ کسی کی نظر تیز نہیں ہوگی۔ چیل نے کہا ”ایسی ڈینگیں نہیں مارنی چاہیے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ تیری نظر مجھ سے بھی زیادہ تیز ہے۔ گدھ اترا کر بولا ”دیکھو گندم کا دانہ زمین پر پڑا ہے‘ کیا تو اسی دیکھ سکتی ہے؟“۔ چیل حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگی اور پھر کہنے لگی ”اس کا کیا ثبوت ہے کہ تو سچ کہہ رہا ہے؟؟“۔ گدھ نے چلا کر کہا ”اس کا ثبوت پیش کرنا بھلا کون سا مشکل کام ہے‘ ابھی دیکھ لے۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی نظر کی تیزی کے گھمنڈ میں اُڑان اُڑا اور گندم کے دانے پر جھپٹا۔ وہاں کسی شکاری نے جال بچھا رکھا تھا‘ گدھ گندم کا دانہ حاصل کرنے کے بجائے اس جال میں پھنس گیا اور اس کی ساری شیخی جاتی رہی۔ چیل نے یہ ماجرا دیکھا اور چلا کر کہا ”کم بخت تجھے گندم کا چھوٹا سا دانہ تو نظر آ گیا لیکن اتنا بڑا جال نظر نہیں آیا۔ اب اپنے انجام کی فکر کر۔

اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ اگر اللہ نے کسی کو اگر کوئی نعمت یا صلاحیت دے دی ہو تو اس پر اترانا نہیں چاہیے بلکہ اس کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اپنے سے کمزوروں کی مدد کرنا چاہیے۔

تعلیم و روزگار

اُردو میں بچوں کا ادب۔آغاز وارتقاء

بچوں کا ادب، کسی بھی ادب کا وہ حصہ ہوتا ہے جو اہم ہونے کے ساتھ ساتھ بنیادی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تعلیمی دنیا میں بچوں کی تعلیم بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ جب ہم بچوں کا ادب کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے وہ ادب جو بچوں کے لیے لکھا گیا ہو اور جو بچوں کی تدریسی کتب سے علیحدہ اپنا وجود رکھتا ہے۔ زیادہ تر نصاب یہ ادب بچوں کو ایک نئی دنیا سے آشنا کرتا ہے چونکہ درسی کتب سے الگ ہوتا ہے اور جس میں قصہ/کہانی ہوتی ہے اسی لیے بچوں کو دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ قصہ کہانی میں چونکہ ایک طرح کا تجسس ہوتا ہے اور یہی عنصر بچوں کی دلچسپی کا سبب بنتا ہے۔

اردو میں بچوں کا ادب اتنا ہی قدیم ہے جتنا اردو کا ادب، کہتے ہیں کہ حضرت امیر خسروؒ اردو ادب کے بنیاد گذار ہیں اور اگر ہم بچوں کے ادب کی کھوج کریں تو سب سے پہلے بچوں کے ادیب کی حیثیت سے حضرت امیر خسرو ہی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بچوں کے مشہور ادیب شفیع الدین بچوں کے ادب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بچوں کے ادب سے مراد نظم ونثر کا وہ ذخیرہ ہے جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھا گیا ہو یا اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے بچوں کے لیے موزوں ہو۔ یا یوں سمجھئے کہ جو ادب چار یا پانچ سال کی عمر سے تیرہ چودہ برس کے بچوں کے لیے مخصوص ہو، اسے ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلاشبہ بچوں کے ادب کو بھی ان اقدار اور خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے، جو کسی بھی زبان کی نظم ونثر کو ادب کا درجہ بخشتی ہیں۔ ان تحریروں میں خیال کی رفعت، جذبہ کی صداقت زبان کی لطافت اور بیان کا حسن شامل ہیں۔''

(شفیع الدین نیئر، اردو زبان میں بچوں کا ادب ''سیمینار اردو میں بچوں کا ادب جامعہ ملیہ اسلامیہ'' :ص ۲۸)

ادب اطفال یا بچوں کا ادب وہ منظمی یا نثری تحریریں ہیں جو بچوں کے لیے ان کی عمر، ذہنی سطح، ادراک وفہم کی صلاحیت، دلچسپیوں اور نفسیاتی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھی جائیں۔ ادب اطفال کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں ادب اطفال کا بھی ایک گوشہ ہوتا ہے۔ ماں کی لوریوں، گہوارے کے گیتوں اور دادی ماں یا نانی اماں کی کہانیوں اور قصوں، لوک ادب یا (Folk lore) کے ایک حصے کے طور پر ادب اطفال کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانی تہذیب و معاشرت کی تاریخ۔ ظاہر ہے کہ اردو میں بھی اس کا سلسلہ عوامی ادب یا لوک روایات کے آغاز کے ساتھ ہی ہوا ہوگا۔

بچوں کے ادب ابتدائی کاوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نسیم الدین فریس میر تقی میر کو ادب اطفال کا

اولین شاعر قرار دیتے ہیں۔ اقتباس دیکھئے:

''اردو شاعری کے خدائے سخن میر تقی میرؔ کے ہاں بھی ادب اطفال سے متعلق بعض تخلیقات مل جاتی ہیں۔ میرؔ کو بچوں کے ادب سے دلچسپی تھی۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے فیض علی کی تعلیم کے لیے جب کہ اس کی عمر بارہ چودہ سال تھی 'فیض میرؔ' کے نام سے فارسی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ جس میں انہوں نے خدارسیدہ درویشوں فقیروں اور مجذوبوں کے محیر العقول واقعات و کرامات حکایات کے انداز میں بیان کیے ہیں۔ اس کتاب کا نام انہوں نے اپنے بیٹے فیض کے نام پر ''فیض میر'' رکھا۔ میرؔ کی اردو مثنویات میں بعض ایک مثنویاں ادب اطفال کے دائرے میں آتی ہیں جیسے مثنوی منوابوزنہ جس میں انہوں نے ایک پالتو بندر کے بچے کی شوخیوں اور شرارتوں کا دلچسپ خاکہ کھینچا ہے۔''

میر تقی میر کے ایک ہم عصر شاعر نظیر اکبر آبادی ہیں جنہیں ترقی پسند نقاد، اردو کا شیکسپیئر کہتے ہیں اور جنہیں عام طور پر ہم عوامی شاعر کے نام سے جانتے ہیں۔

بچوں کے ادب کے سلسلہ میں سب سے اہم نام نظر اکبر آبادی کا ہے۔ جنہوں نے بچوں کے لیے نہایت دلچسپ مزیدار اور خوبصورت نظمیں لکھیں۔ نظیر پیشے کے اعتبار سے معلم تھے۔ وہ بچوں کو پڑھاتے تھے۔ اس طرح انہیں بچوں کی نفسیات، ان کی دلچسپیوں اور رجحانات کو قریب سے پرکھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ زندہ دل اور آزاد خیال کے انسان تھے۔ انہیں عوامی زندگی میلوں، ٹھیلوں، عید تہوار سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے بچوں کے لیے جو نظمیں لکھیں ان میں اپنے مشاہدات اور معلومات کو بھی خوب بروئے کار لایا ہے۔ ان میں گلہری کا بچہ، ریچھ کا بچہ، پودینے اور گڑھ پنکھ کی لڑائی۔ تل کے لڈو وغیرہ اہم ہیں۔ انہوں نے ان نظموں میں اخلاقی قدروں کا درس بھی دیا ہے۔

ادب اطفال کی تخلیق کے سلسلے میں نظر اکبر آبادی کے لکھنوی معاصر انشاء اللہ خاں انشاء کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ جنہوں نے کہانی کنور ادوے بھان اور رانی کیتکی کی عنوان سے ایک قصہ اسی نثر میں لکھا جس میں سارے الفاظ ہندوستانی ہیں، عربی اور فارسی کا کوئی لفظ انہوں نے استعمال نہیں کیا۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے اسے نہ صرف بچوں کی کہانی بلکہ بچوں کے لئے لکھی گئی پہلی نثری کہانی قرار دیا۔ انہیں کو پیروی میں ان کے شاگرد و ڈاکٹر خوشحال زیدی نے بھی اسے بچوں کی تصنیف بتایا ہے۔

اس طرح ڈاکٹر سیدہ مشہدی لکھتی ہیں ''میں رانی کیتکی کو بچوں کے ادب میں اہم افسانہ تصور کرتی ہوں''

(ڈاکٹر سیدہ مشہدی، اردو میں بچوں کا ادب رانچی 1990ء ص 112)

ملک و ملت کے مستقبل کا دارومدار بچوں کی صحیح تربیت اور تعلیم پر منحصر ہے۔ تعلیم و تربیت صرف روایتی انداز سے ممکن تو ہے مگر شاید پوری طرح اطمینان بخش نہیں ہوسکتی جب تک کہ بچے بھی اس تعلیم و تربیت کو پوری طرح قبول نہ

بچوں کا ادب

کرلے۔

اردو میں بچوں کے ادب کے سلسلے میں میر تقی میر، نظر اکبر آبادی، مرزا غالب، حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور اسماعیل میرٹھی وغیرہ نے اپنی تحریروں کے زمانہ آغاز ہی سے التفات فرمایا ہے اور بیسویں صدی میں علامہ اقبال نے بچوں کے ادب کی جانب خصوصی توجہ دی اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور سے ہی تمام نمایاں بڑے نثر نگار اور شاعر بچوں کے لیے شعر اور نثری تخلیقات پیش کرنے میں دلچسپی لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کے ہم عصروں میں بہت سے فنکاروں نے اپنی گراں قدر تخلیقات سے بچوں کے ادب میں اضافہ کیا۔ جن میں پنڈت برج نارائن چکبستؔ، تلوک چند محروم، حامد حسن قادری، نظم طباطبائی حامد اللہ امیر میرٹھی، سرور جہاں آبادی، خواجہ حسن نظامی، شفیع الدین نیر، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر جگن ناتھ آزاد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ دور حاضر میں عادل امیر دہلوی اور امجد حسین حافظ کرناٹکی نے اپنی زندگی خاص طور پر ادب اطفال کے لیے وقف کردی۔ اس طرح بچوں کے ادب کی ترویج اور فروغ میں خواتین کا بھی نمایاں حصہ رہا ہے۔ جن میں صالحہ عابد حسین، قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو میں بچوں کے ادب کو فروغ دینے میں صحافت نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو کے بعض رسائل اور اخبار صرف بچوں کے ادب کے فروغ دینے کے لیے شائع کیے جاتے ہیں۔ حیدرآباد سے بھی بچوں کے ادب کے حامل چند رسائل شائع ہوئے ہیں۔

حیدرآباد سے نکلنے والے بچوں کے اہم رسائل میں ''ادیب الاطفال''، ''اتالیق''، ''ہزار داستان''، ''سب رس''، ''تارے''، ''کلیاں''، ''نونہال''، ''ننھا پرواز''، ''روشن'' اور ''بچوں کا نونہال'' وغیرہ ہیں۔

1۔ ان رسائل کا مقصد بچوں کی سیرت و کردار کو اخلاقی مضامین کے ذریعہ سدھارنا ان میں علمی شغف اور عمل کا جذبہ پیدا کرنا۔

2۔ مذہبی تعلیمات سے واقفیت کرواتے ہوئے ان پر کاربند رہنے کی ترغیب دینا، طرز معاشرت کی اصلاح، تعصب سے گریز، غلط تاریخی واقعات کی تصحیح اور امن و بھائی چارے کے خیالات کی اشاعت۔

3۔ بچوں میں قومی و ملکی حمایت بیدار کرنا، قانون کا احترام و اطاعت سکھانا، والدین و بادشاہ وقت سے محبت و بزرگی کو رائج کرنا اور ان کی فرمانبرداری کی ترغیب دینا۔

4۔ مختلف اقوام میں اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کو فروغ دینا اور بچوں میں سب مذاہب کا احترام پیدا کرنا۔

5۔ بچوں میں مطالعہ اور مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنا۔

بچوں کے رسائل کی طرح اردو میں بچوں کے ادب کے حامل چند اخبار بھی شائع ہوئے ہیں۔ یہاں بچوں کے

اولین اخبار کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

''بچوں کا اخبار'' نے بچوں کے رسائل کے لیے راہ ہموار کی اور اردو میں بچوں کے لیے رسال و جرائد کا لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔ بچوں کے رسائل نے کئی نسلوں کی آبیاری کی ہے۔ ذہن سازی علمی مزاج کو فروغ دینے میں ان رسائل نے جو خدمات انجام دیے ہیں۔ ان کا انکار محال ہے۔

اردو میں سب سے پہلا بچوں کا رسالہ ''بچوں کا اخبار'' ہے جو مئی 1902ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر منشی محبوب عالم تھے۔ چنانچہ منشی محبوب عالم کو بچوں کے رسائل کا باوا آدم کہا گیا ہے۔ انہوں نے اردو میں پہلی بار بچوں کی دلچسپی اور ان کی تعلیم و تربیت اور اخلاق و آداب کی تعلیم دینے کی غرض سے یہ اخبار جاری کیا۔ اس کے بعد بے شمار بچوں کے رسائل و جرائد ملک کے مختلف مقامات سے بچوں کے لیے جاری ہوئے۔

''بچوں کا اخبار'' کے بارے میں بچوں کے ادب کے اسکالر جنہوں نے کتب خانہ خدابخش میں اس اخبار کو دیکھا ہے، لکھتے ہیں:

''جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے لاہور سے مئی 1902ء میں ''بچوں کا اخبار'' جاری ہوا جس کے مدیر منشی محبوب عالم تھے، جنہیں بچوں کے رسائل کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ بچوں کی اس اولین رسالہ کا پہلا شمارہ راقم الحروف کو خدابخش لائبریری پٹنہ سے حاصل ہوا۔ اس رسالہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مختلف موضوعات پر مضامین ہوتے تھے جو بچوں کی دلچسپی کا باعث ہوتے تھے۔ بچوں کا اخبار 1912ء تک جاری رہا۔''

(ڈاکٹر نثار احمد، ہندوستان میں بچوں کے رسائل۔ص 20)

اس طرح اردو ادب میں ادب اطفال کی روایت کے دور اول کا آغاز جو امیر خسرو سے ہوا تھا اس کا خاتمہ غالبؔ پر ختم ہوتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر شیخ عبدالکریم
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
گورنمنٹ ڈگری کالج فلک نما
حیدرآباد۔053 500
موبائل:9059488400

مضمون نگاران سے ایک درخواست

مضامین صاف، خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں ۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروا رہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا صحیح نام جو بنک اکاؤنٹ میں درج ہے ضرور لکھیں اور بنک پاس بک کی کاپی، اپنا مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر روانہ کریں۔

ادارہ قومی زبان

ولی دکنی کی غزلوں میں تدبھو اور تت سم

تدبھو اور تت سم یہ کوئی ایسی جدید اصلاح نہیں ہے جس پر مزید گفتگو کی جائے، دراصل ہندی زبان و ادب میں اس کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ انہی اشیاء کو اردو زبان ادب میں ٹکسال اور ریختہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تت سم کا معنٰی ہوتا ہے یعنین، اہلِ لغت نے اسے جس معنی کے لیے وضع کیا ہے۔ اور تد بھو کا معنی ہوتا ہے ہو جانا، بدل جانا، بگڑی صورت۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ سرل اور آسانی کے ساتھ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس کے تلفظ کی ادائیگی میں کسی قسم کی دقّت پیش نہ آئے۔ درحقیقت فصاحت کی تعریف کی ایک شق یہ بھی ہے کہ لفظ زبان پر گراں نہ گزرے۔ تت سم کو لفظ کے اصل سمجھا جاتا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی صورت جسے ماہرینِ لسانیات بگڑی صورت تسلیم کرتے ہیں۔ اسی بگڑی صورت کو تدبھو کے نام سے جانا جاتا ہے جسے ہم اہل اردو ریختہ کے نام سے جانتے ہیں۔ تدبھو بولی میں مستعمل ہے اور بولی میں پائے جانے کی وجہ سے اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بولی وہ شئے ہے جس سے آدم خاکی اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے آدان پردان کرتے ہیں اور یہی بولی آگے چل کر زبان کا روپ دھارن کرلیتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ تشکیلی مراحل سے گذر کر تہذیب کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ جس کے تلے تہذیب و تمدن کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ یہی تہذیب و تمدن مختلف پگڈنڈیوں سے حذر کرتے ہوئے ساہتیہ یعنی ادب و فن کو جنم دیتی ہے۔ یہیں سے تخلیق کار تہذیب و تمدن کی حفاظت کے لئے ہمہ اقسام کے فنون کو خلق کر کے اپنی ذہنی کاوش و دستی ہنر مندی کو صفحہِ قرطاس پر بکھیر جاتا ہے۔ ہم اسے ادب و فن کے نام سے معنون کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارا فریضہ بن جاتا ہے کہ حسن و ادا، جلال و جمال کے ساتھ اس ورثہ کی حفاظت کریں، کیوں کہ اس کی حفاظت ہماری تہذیب، ہمارا کلچر ہمارا تمدن، ہماری ثقافت، ہمارا معاشرہ، ہماری وراثت کی حفاظت ہے۔ جو بھی فکر و فن کا سرمایہ ادیب پیش کرتا ہے وہ اس کی فراست اور ہنر پر منحصر ہے۔ اس لئے راقم تہذیب و تمدن کو مقدم جانا اور اس کی نگرانی کرنے والی شئے کو مؤخر۔ باوجود اس کے کہ دونوں لازم ملزوم شئے ہے۔ نتیجۃً جہاں تک ناچیز کی رسائی ہوئی کہ بولی ہی اصل اصیل ہے اور زبان اس کی نکھری ستھری شئے جس کے وجود سے جہانِ ادب و ثقافت میں رنگ و بو قائم ہے۔ معرکہ آرائیاں ہیں، جوش ہے، ولولہ ہے۔ ان سب سے بڑھ کر لسانی معیار کا امین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تدبھو کے بطن سے تت سم کا وجود عمل میں آنا ممکن ہوا۔ اصل زبان کے ایسے الفاظ جو تغیّر تبدّل کے ساتھ اسی زبان یا دوسری زبان میں مستعمل ہو اسے تدبھو کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح ہندی زبان سے نکلی ہے۔ جس میں سنسکرت کے ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جس میں تبدیلی واقع ہوئی ہو۔ تت سم

مضامین

جس کے معنی ہوتے ہیں'مثل، جیسا'' یہ بھی ہندی زبان کی اصل اصطلاح ہے جس میں سنسکرت کے ایسے الفاظ کا استعمال ہونا جو سنسکرت کے اصل الفاظ ہوتے ہیں۔ جیسے گرام (موضع) ہندی میں بھی یہی استعمال ہوتا ہے ۔ یہ دونوں اصطلاحیں ہندی زبان میں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں اور ہندی زبان کے فنکار اس کے ذریعے سے اپنی تخلیقات کو مؤثر کن بنانے کے ساتھ عوام سے بھی جوڑ تے ہیں۔ بازاری الفاظ کو اگر تد بھو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جیسا کہ اس قسم کے الفاظ ہندی کے ساتھ دیگر زبانوں میں بھی پہلے استعمال ہو چکے ہیں اور ہو بھی رہے ہیں۔ محمد حسن لکھتے ہیں:

''ودیاپتی کی تصنیف میں یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اب لکھنے پڑھنے میں تد بھو الفاظ بے ساختہ استعمال کیے جانے لگے تھے اور ایک ہی مفہوم کے ادا کرنے کے لیے ہمیں سنسکرت تت سم الفاظ کے پہلو بہ پہلو تد بھو الفاظ یا عام بول چال کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ ایک ادبی زبان کے نقوش واضح ہونے لگے اور پراکرت سے اپ بھرنش تک جو عبوری دور مختلف منزلیں طے کر رہا تھا اب ایک منزل تک پہنچ گیا۔ اس منزل کے سب سے قدیمی نشانات ہمیں ویر گا تھا عہد میں ملتے ہیں۔'' (محمد حسن، ہندی ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، 2007ء، ص:28)

اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس زمانے میں بھی یہ اصطلاحیں ادب میں لکھی جاتی تھیں جو غیر ادبی مانی جاتی تھیں لیکن دھیرے دھیرے غیر ادبی اصطلاحیں ادب کے اس خانے میں اپنے آپ کو رکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور ادیب اسے بحسن و خوبی ادب میں برتنے لگے۔

اب ہم ولی دکنی کی شاعری میں دیکھیں کہ تد بھو اور تت سم کی کارفرمائی کہاں تک ہے۔ ولی دکنی نے اپنی شاعری اور اپنے کلام میں تت بھو اور تت سم یعنی ہندی الفاظ کی شمولیت کو بہت ہی خوش اندامی اور خوش نوائی سے برتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ یہ بات بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ولی دکنی نے الفاظ کے تراکیب، فقرے کی بندش میں بلا کی چابکدستی ور دانائِ فکر کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مطلب یہ کہ بولی کے وہ بول جسے عوام و خواص میں یکساں مقبولیت حاصل رہی اسے اپنے اشعار میں بروقت استعمال کیا ہے۔ مثلاً تتسم کے ان الفاظ کا مشاہدہ کیجئے جسے ولی دکنی نے اپنی غزلوں میں برتا ہے اور ان کے برتنے میں ہنر مندی بھی دِکھائی ہے۔ جیسے وچن، سوریہ، جن، پرتگالی، شتاب، نین، ہردئے، چندا، شریر، سنگار، چرن، لوک، یگن، ادھک، سکھ، جگت، گگن، دھڑ، ساستر، دردھا، مکھ وغیرہ بطور مثال غزل کے چند اشعار بھی آپ کے سامنے ہیں:

دل کوں ،گرمرتبہ ہو درپن کا
مفت ہے دیکھنا سری جن کا
جامہ زیبوں کوں کیوں تجوں؟ کہ مجھے
گھیر رکھتا ہے دور دامن کا

ooo

مضامین

اندوہ غم کی بات ،ترے باج بن گئی
آواز میری آہ کی، پھر تا گگن گئی
سرمے کا منھ سیاہ کیا ان نے جگ منیں
جس کے نین میں پیو کی خاکِ چرن گئی
اب لگی ولی ! پیا نے دکھا یا نہیں درس
جیوں شمع، انتظار میں ساری رین گئی

000

عاشق کے مکھ پہ نین کے پانی کوں دیکھ توں
اس آر اسی میں راز نہانی کوں دیکھ تو،
مستی نئیں محشر تلک کو نیں کوں بسرا ہے دو
جو تجھ نین کے جام سوں مدہ پی کے متوالا ہوا
کھینچیں آپس انکھیاں نئیں جیون کھل جواہر
عشاق کے گر ہاتھ دو خاک چرن آوے
ہیرے کا تجھ دتن سو روشن ہوا ہے بردا
یاقوت سوں آدھک ہے تجھ رنگ لب کی شوخی

اسی طرح ان کی غزلیات میں تدبھو کے بے شمار الفاظ ہیں۔ وہ چاہے عوامی زبان میں ہوں یا معیاری ہوں یا غیر معیاری۔ اس سے بحث نہیں، ولی دکنی کے شعر وسخن پر اس قسم کے اعتراضات جو کیے جاتے ہیں وہ اس دائرے سے برحق معلوم ہوتے ہیں کہ انہوں نے کچھ پچھڑے طبقے کے الفاظ کو شاعری میں برتا ہے جسے کسی نہ کسی طرح معیوب سمجھتے تھے۔ اس سے صرف نظر تدبھو کے وہ الفاظ ومعانی جس سے انہوں نے اپنی شاعری میں رنگ بھرے ہیں۔ مثلاً انکھیا، کناراں، بھواں، سری جن، نین، جوشن، تل، پیسا، بکتر، چاکھا، کیش، کیشاں، باج، بہو، اپن، درپن، جھنکار، بھید، بھوجھے، سجن، کاسی، جوگی، باسی، بیراگی، اداسی، سنیاسی، ناگن، پیاس، موں، کڑھایا، کجر، روپ، چرا، رس بھری، رسیلا، مہنہ، دھوم، چھمبن، سرج، آگن، جھلک، نمک، چنچل، اندھار، اندھیارا، لت، لٹھ کا جل، بچپن، بچن ہار، گھونگھٹ، دھاوا، مٹھائی، دوجے، انجھوا، جوگن، پگ، نہال، نہال ترن، بالا، چاند، اینٹھنا، بوجھے، ٹھار، جگہ، جگ، برہ، لاج، باج، گرم لو، شدھ، کاڑھنا، بھجنگ، نچنت، پرم، جوت، بجھاوے، بھیتر، بانسلی، سنگھار، پنتھ، بھید، چھند، مڑ، ادھک، بھاو، چھب، دراڑ، ہٹ، ہردا، وغیرہ، غرض اس قبیل کے بہتیرے الفاظ ایسے ہیں جس سے ولی دکنی نے اردو زبان کی کشت کاری کی اور اس کشت کاری سے جو اپج پیدا ہوا وہ آج تک سودمند ہے۔ اور اسے اردو ادب کا دامن سرسبز شاداب ہے۔ صدیوں بیت جانے کے بعد بھی اس کنبہ کا لسانی پس منظر سے مطالعہ کرتے ہیں تب معلوم ہوتا ہے کہ یہی بولی اصلِ زبان ہے جسے ہم ریختی سے یاد کرتے ہیں اور یہی تدبھو کہلاتے ہیں جس کا ماخذ ومرکز کچھ اور ہے۔ ولی دکنی کے ان اشعار کے مطالعہ سے آپ اندازہ قائم کرسکتے ہیں کہ کس خوبصورتی کے ساتھ تدبھو کا استعمال وہ اپنی شاعری میں کرجاتے ہیں۔ بطور مثال مندرجہ ذیل اشعار مشاہدہ کیجیے:

تجھ مکھ کا رنگ دیکھ کنول جل میں جل گئے
تیسری نگاہ گرم سوں گل گل پگھل گئے

مضامین

نکلتا جب کٹاری ہاتھ لے کر
دو عالم اس کٹاری سوں دودھڑ ہے
جگت جوگی ہوا ہے دیکھ کوں
سُرج جوگی فلک جوگی مڑ ہے
نرگس قلم ہوئی ہے سجن تجھے نین آگے
شکرؔ ڈوبی ہے آپ میں تیرے بچن کے آگے

بہرحال میں ان الفاظ و معانی کی طرف توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں جسے اردو زبان ادب میں برتا گیا ہے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جو الفاظ ہندالاصل ہیں وہ ولی دکنی کے کلام میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ اردو شعرا کے یہاں اس طرح کے الفاظ بہت کم ملتے تھے بلکہ نا کے برابر ہوا کرتا تھا۔ میرا مشاہدہ ہے کہ سرسید اور حالی جیسے سہل پسند، سادہ سلیس الفاظ کے پرپوگیوں نے بھی اس سے اعتنا برتتے ہیں۔ بلکہ ان مفکرین نے اس بات کی پرزور وکالت کی کہ ہماری تحریریں، ہماری تقریریں عوام الناس کی زبان و بیان میں ہوں، ان کی بولی میں ہوں، ان کی بات چیت میں ہوں، یہ بھی سچ ہے کہ مذکورہ ادیبوں نے سہل پسندی کو عملا برتے بھی ہیں اور برتنے کی ترغیب بھی دی لیکن ولی دکنی سے مرعوب ہو کر نہیں بلکہ ان کی تفہیم و ترسیل کا میعار ہی الگ تھا۔ ان کی پیغام رسانی، ان کی زبان و بیان کی ترویج کے پیرائے کچھ مختلف تھے۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین ہونا چاہئے کہ ولی دکنی دنیائے سخن میں ایک ایسے معرکہ آراء دور میں پیدا ہوئے جہاں مفرس، معرب کا خوب چلن تھا۔ اس پر دسترس رکھنا کمال علم و سخن تصور کیا جاتا تھا۔ ان ادیبوں کی علم دانی، شعر گوئی پر فخر و مباحات کئے جاتے تھے۔ ادباء تلذذ آمیز سخن سے سخن آزمائی کرتے تھے جہاں دور کی کوڑی لانے کے مماثل خیال ہوں، الفاظ صیقل اور آراستہ ہوں، جملے طمطراق ہوں۔ ان میں ادب اور ادیب کو ہی پروقار تسلیم کیا جاتا تھا۔ انہیں نابغہ روزگاری کا تمغہ حاصل تھا۔ ولی دکنی نے ایک ایسے پرفتن دور میں عوام کے درمیان شاعری کا چراغ جلایا اور ان کے دلوں کو چھونے والی شاعری کی، عوامی بول چال کے الفاظ کی نوع بنوع گل کاریوں سے فن کو تابنا کی بخشی اور عوامی بولی کو استناد عطا کیا۔ اسی سے ولی کی انفرادیت کے سوتے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے لسانی شعور، فہم سوجھ بوجھ اور اجتہادی لیاقتوں کی بنا پر فارسی یا فارسیائی ادب، ہندی یا ہندیائی ادب کے آپسی میل میلاپ سے لطیف جذبے پیدا کیے جس سے اردو زبان و ادب کو نئی آواز ملی، نیا رنگ ملا، اشعار کو گفتگو، گفتگو کو انداز، بالآخر انداز میں لطف و چاشنی کی رس مالائیں بکھیر دیں۔ راقم اپنے اس خیال کو مزید تقویت دینے کے لیے جمیل جالبی کے اس خیال کو موزوں سمجھا۔

''ولی دکنی کی آواز نے سب کو لہلوٹ کر دیا۔ ولی نے قدیم ادب کے زندہ عناصر کو اپنے تصرف میں لا کر فکر و نظر کی سطح پر ایک نیا معیار قائم کیا جو ریختہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ وہ نئی سطح تھی جہاں شمال، جنوب اور سارے برعظیم کے تخلیقی ذہنوں کی آرزوئیں تکمیل پا رہی تھیں۔ برعظیم کے طول و عرض میں چھوٹے بڑے سب شاعروں

مضامین

نے اس نئے معیار کو واحد ادبی معیار کے طور پر تسلیم کر لیا۔''
(تاریخ ادب اردو، حصہ اوّل، صفحہ ۵۸۹۔)

بہر کیف اردو زبان و ادب اس کا مرہونِ منّت تو ہے ہی۔ لہٰذا یہ کہا جائے تو بے جا نہیں کہ ولی دکنی نے اپنی تخلیقی قوت کے ذریعہ ایسے دلکش تراکیب، عوامی تشبیہات و استعارات خلق کئے ہیں کہ جس سے غزل کو وسعت ملی، اور ان کے فن مین نکھار پیدا ہوا، معنویت میں گہرائی پیدا ہوئی اور انھوں نے خیال کو کشادگی بخشی، خوبصورت طرز، شگفتہ لہجہ دیا جس میں بلا کی تاثیر کارفرمائی ہے۔ مثلاً غزل کے چند اشعار دیکھئے:

تیرے بھواں کوں دیکھ کے کہتے ہیں عاشقاں
ہے شاہ جس کے نام چڑھی دو کماں آج

گنگارواں کیا ہوں، آپس کے نین ستی
آرے صنم شتاب ہے روز نہاں آج

جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم
ترکش میں تجھ نہین کے ہیں ارجن کے بان آج

ہوتی آرسی جوگن ترے مکھ کے تصور میں
بھبھوتی مویہ لیادم مارتی ہے خاکساری کا

کھڑا ہے راستی کے دم میں یک بیک پرسوجیوں جوگی
ترے قدسوں لگا ہے دھیان سرو جوتہاری کا

اردو ہندی کے درمیان امتیاز قائم کرنے والی شئے کے مطالعہ سے یہ گمان یقین میں بدل جاتا ہے کہ یہ دونوں زبانیں اپنی بنیادی قواعد اور سرمایہ الفاظ کے اعتبار سے برصغیر کے دو قریب ترین زبانیں ہیں جیسا کہ ماہرین لسانیات اس بات پر مہر ثبت کر چکے ہیں کہ دونوں زبانوں کی کنڈلی کھڑی بولی سے ملتی ہے بات اتنی سی ہے کہ اردو زبان میں فارسی اور عربی کا کس قدر غلبہ زیادہ دکھائی دیتا ہے اس کے مدّ مقابل ہندی زبان میں سنسکرت کے الفاظ بکثرت استعمال ہو رہے ہیں، ماہرالسنہ یہ بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ اردو زبان کا جنم ہندی زبان سے قبل ہے لیکن کسی صورت امتدادِ زمانہ تک ہندی، ہندوی، ہندستانی، گجری، دکنی وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا رہا ہے جو ہندوستانیوں کی زبان تھی۔ جیسا کہ تاریخ اردو ادب کے پنّوں میں رقم ہے۔ اور وہ پتّے یہاں ابھی ناچیز کے دائرے تحریر کے ماسوا ہے۔ اس لئے اس بحث کو یہیں ترک کرتا ہوں۔

رہی بات ولی دکنی کی تو ان کی فکر و فن کا دوسرا رخ ہمارے سامنے ہے۔ وہ یہ کہ تت سم اور تد بھو کے راستے سے بھی ولی کی غزلیات میں محبوب کی تلاش کی جانی چاہئے جس سے غزل کو مزید وسعت اور الفاظ کو معانی میسر آئے۔ یعنی ولی دکنی کے محبوب کا رنگ ڈھنگ بالکلیہ ہی جدا ہے، جس میں فطرت ہے، حسن ہے اور یہی چیزیں ان کو ان کے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ طئے شدہ ہے کہ انہوں نے محبوب کی تصویر کشی خالص ہندوستانی یا دکنی کیمرہ سے کی ہے۔ یہ بات غزل کی داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر کہی جا سکتی ہے۔ اس کا یہ

مضامین

مطلب نہیں کہ ولی نے عصرِ رواں کی شاعری سے اجتناب کیا۔ بلکہ اپنے دور کی شاعری سے بھرپور رس نچوڑا ہے۔ ان خیالات پر کسی اور موقع سے گفتگو ہوسکتی ہے۔ داخلی شہادتوں سے مراد یہ ہے کہ محبوب کے رنگ وروپ، ناز ونخرے، وعدوموعود، وفائیں وجفائیں، سب کے سب شودھ ہندی سے مزیّن ہیں اور ولی دکنی کے زمانے کے خالص ہندوستانی زبانیں ہیں۔ غزلیات کے بیشتر مضامین میں ہندوستانیت علاقائیت کی ساجھا داری بہتر شدّ ومدّ کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی محبوب کی گلیاروں کی بوباس، ریت رواج جیسی چیزیں وارفتہ طور پر بیان ہوئے ہیں جسے ہم داخلی شہادتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح خارجی شئے سے میرا مقصود اشعار کے وہ ظاہری پرتیں ہیں جو الفاظ اور اس کی جوگل بندی، شعر، اور اس کے تراکیب، شعر اور شعری حسن کی نزاکت میں علاقائیت اتم طور پر ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ ولی دکنی اپنے محبوب کی بولی وچن اور انداز حُب سے غزل کی اہمیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہی نہیں بلکہ لاثانی ہیں۔ ولی دکنی کا معشوق ہندوستانی، دکنی، گجری راہوں کے راہی ہیں کیونکہ ان کی سرگوشیاں، ان کی چھیڑ خانی، شرارت، عہد و پیماں سب خاک وطن کے رس میں منڈلاتی اتراتی ہیں۔ برّعظیم کے محبوب کا یہ طرفہ رہا ہے کہ لجاجت سادگی، معصومیت کو اپنے ہاتھوں سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی زبانیں عشق کا اظہار کرتے کرتے گنگ سی ہوجاتی ہیں تب بھی اپنے ہاتھوں سے جانے نہیں دیتی ہے اور دبے لفظوں میں دبے لب یہ کہہ جاتی ہے کہ میرا محبوب کتنا سادہ ہے لیکن برملا اقرار واظہار نہیں کرپاتی ہیں۔ ولی دکنی کے محبوب کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس خیال کی توثیق کے لئے غزل سے چند اشعار پیش ہیں:

جب سوں دیکھا ہوں زلف کی میں لٹ
یاد میں اسکی تن گیا سب گھٹ
ہجر ترے سوں اے پری پیکر
اشک پڑتے ہیں چشم میں پٹ پٹ
خاک مکھ پر لگائے جوگی ہو
لیکے بیٹھا ہوں تجھ پرہ مٹ
تجھ بنا اب نہیں مجھے طاقت
کب تلک جیوں کروں آپس کا کھٹ
تب میں مجنوں نمن ہو پھرتا ہوں
جب سے تجھ مکھ کی مجھ لگی ہے چٹ

ooo

کوچہ یار عین کا سی ہے
جوگی دل وہاں کا باسی ہے
پی کے بیراگ کی ادا سی سوں
دل پہ میرے سدا اداسی ہے

ooo

اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال
بندے ہر دوار باسی ہے

مضامین

زلف تیری ہے موج جمنا کی تل
نزک اس کے جیوں سناسی ہے
یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر
ناگنی جیوں کنوے پہ پیاسی ہے

مذکورہ اشعار سے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ ولی دکنی کی شاعری زمینی ہے، جنہوں نے محبوب کو اصل روپ میں دیکھا ہے۔ جہاں وہ محبوب سے ہم کلام ہیں اس کلام میں اصلیت، جوش، سادگی کے ساتھ زمینی حقائق پر مبنی گفت و شنید ہیں۔ یہاں ولی دکنی نے تد بھوا ورتت سم کو بھرپور طریقے سے برتا ہے۔ تد بھوا ورتت سم کی بات چیت کا لہجہ عطا کیا اور حاب محبوب کی محبت کو فطرت کے قریب تر کر دیا ہے جن کے خیالوں میں سادگی، اسلوب میں بانکپن، لہجے میں اندازِ غزل ہے۔

جب ولی دکنی نے ان باتوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے غزل کہی تھی جبکہ غزل کا تصور کسی اور زبان سے مستعار ہے جسے اس کا پیدائشی حق حاصل ہے۔ شاعر نے جب اس رنگ آہنگ میں تخیل پرواز یاں کرتے ہیں۔ یعنی ان کے ہم عصر شعراء کے دل دماغ، قلم و قرطاس پر راست یہ بات غالب رہی کے ان کی سوچ بچار تک میں فارسی دانی کا آئینہ ہوتا تھا۔ لیکن ولی دکنی نے وقت کے تقاضے کے پیش نظر محبوب کے خد و خال، لب و رخسار، عارض و زلف، قد و قامت، ان کی ناز برداری، اور خوشبو ئے دہن وغیرہ سب کا بیان غزل میں اتنا حسین جاذب قلب و نظر پُر معنی ہے کہ ان کے محبوب کی طرح غزل کے اشعار بھی جیتا جاگتا مرقع نظر آتا ہے۔ چلتی پھرتی بوس وکنار ہوتی تصویر دکھائی پڑتی ہے۔ شاید ان ہی کی بدولت سراپا نگاری میں ولی دکنی کو ملکہ حاصل تھا۔ اس لئے انہیں سراپا نگار شاعر بھی تصور کرتے ہیں۔ اس قبیل کے رنگ تغزل کا مطالعہ کیجئے جس میں فارسی الفاظ و تراکیب اور ایرانی عکسِ محبوب روشن ہیں:

آج سر سبز کوہ صحرا ہے
ہر طرف سیر تماشا ہے
چہرہ یارو قامت زیبا
گل رنگیں و سرو رعنا ہے
معنی حسن و معنی خوبی
صورت یار سوں ہویدا ہے
کرنازک و دہاں صنم
فکر بار یک ہے معمّہ ہے
موبہ کو اس کو ہے پریشانی
زلف مشکیں کا جس کوں سوداں ہے
جوں ولی رات دن ہے محوخیال
جس کوں تجھ وصل کی تمنا ہے

ooo

کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ
کہ آتشِ گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ
عجب کچھ لطف رکھتا ہے، شبِ خلوت میں گلروسوں

مضامین

خطاب آہستہ آہستہ ،جواب آہستہ آہستہ
مرے دل کوں کیا بے خود، تری انکھیاں نے آخر کوں
کہ جیو بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

مندرجہ بالا غزل کی فارسیت اور اس کے مضمون پر عش عش کیجئے۔مرقع کشی کے حسن بالائے حسن پر سر دُھنیے کہ شاعر کس لطافت اور نزاکت کے ساتھ محبوب سے ہم کلام ہے۔شاعر کی اس سراپا کشی میں سلاست ہے، ندرت ہے، صفائی ہے، غنایت ہے، کمر نازک، فکر باریک، زلف مشکیں، موبہ مو کے تراکیب کی نازک اندامی، فارسیٔ الاصل ہی تو ہیں۔ جو اس بات پر دال ہے کہ شاعر اپنے عہد کے ہاتھوں مجبور ہے جو فارسی دانی کی صلاحیت کا سکہ بھی جمائے ، دوسرے یہ کہ غزل کا وجود اس کی خمیر کا یہ اصرار بھی رہا جس کے ہاتھوں شاعر مجبور محض ہو جاتا ہے ۔ یہاں ولی دکنی وقت کے ہم رکاب نظر آتے ہیں۔ان کے تغزل کا فارسی طرز میں غرق ہے کیونکہ یہاں ان کا محبوب ہندی نہیں ہے۔ اور اگر مان بھی لیا جائے تو بس خواب آور ہے۔اس لئے انہوں نے اصل غزل کا سہارا لیا اور فارسیائی صنائع بدائع کا خوب خوب استعمال کیا ہے۔ولی دکنی کی محبت بے لاگ ہے اس میں تکلف اور مقصدیت کا شائبہ نہیں۔ سب سے اہم چیز یہ کہ ولی دکنی محبوب سے غمِ روزگار کا رونا نہیں روتے ہیں ۔ان کی غزلیات میں چند ایک اشعار ہی ایسے ہیں جس میں غم روزگار اور مفلوک الحالی کا شکوہ ملتا ہے۔ وہ بھی دبے چھپے طرز کے ہی گلے شکوے ہیں۔ان کی غزل کا یہ اعتبار ہے کہ وہ قلاّشی ، تنگ دستی سے معذور ،محبوب کے در پر سر پٹختے نظر نہیں آتے ہیں۔ان کی محبت محبت ہے۔

ولی دکنی کی شاعری ہر دور میں اوروں سے یوں جدا رہی کہ شاعری میں اپنی لفظیات ، اپنا شعور، اپنی فکر، اپنا ذہن اور اپنی آنکھیں روشن رکھیں ۔ اس طرح یہ کہنا مناسب ہوگا کہ دریوزہ گرانِ فن وفکر کی بھیڑ میں ان کی غزلیات نئے تقاضے کے منفی تخیّلات وتصوّرات کے ساتھ ادبی وثقافتی معاشرے پر پڑنے والے اثرات سے کسی قدر محفوظ رہے اور یہیں سے انہوں نے ایک الگ قسم کی بنیاد ڈالی جو انہی کا اثاثہ رہا۔ وہ زبان وبیان میں یکتائے روزگار تھے۔ان کی قادرالکلامی پر اردو کو فخر ہے۔ ان کے کلام میں حلاوت ہے۔ لطافت ہے۔ اثر آفرینی ہے۔ بلا قیل و قال انہی رنگوں نے ولی دکنی کو ولی دکنی بنایا، کلام کو جاودانی بخشی ، غزل کی آبرو کی حفاظت کی ، فن پارے کو وسعت دی ،محبوب کو زبان ، زبان کو معانی ، معانی کو رنگ ، رنگ کو حسن ،حسن کو دوام اور بس۔

☆☆☆

اے۔آر۔منظر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، اسکول آف ہیومانیٹیز
یونی ورسٹی آف حیدرآباد
گچی باؤلی۔حیدرآباد 046 500
موبائل: 09848956103

کیرلا کے بابائے اردو: سید محمد سرورؔ

ابھی فرسودہ اسلوبِ ستم جاری ہے دنیا میں
تگ و دو حق و باطل کی ابھی ساری ہے دنیا میں
غذائے بازو شاہیں ہے ابھی کنجشک بے مایہ
ابھی خونِ جگر مزدور طبقہ کا ہے سرمایہ

آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ مندرجہ بالا اشعار ایک ایسی شخصیت کی ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی اور نہ ہی انہوں نے ایسے خطے میں اپنی زندگی گزاری تھی جہاں اردو یا ہندی زبان بولنے والے رہتے ہوں۔ یہ اشعار کیرلا کے بابائے اردو کہلائے جانے والے شاعر سید محمد سرورؔ کے ہیں جنہوں نے کیرلا میں اردو کی ترقی و ترویج میں اپنی پوری زندگی گزار دی۔ کیرلا جنوبی ہندوستان کی ایک ایسی ریاست ہے جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد 15,000 سے زیادہ نہیں۔ ایسی ریاست میں کسی کا معیاری اردو میں ادب تخلیق کرنا، اس کی اشاعت ہونا اور اس کا مقبول ہونا بڑے تعجب کی بات ہے۔ کیرلا میں اردو کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ایسے گنے چنے لوگ ہی ملیں گے جنہوں نے ادب تخلیق کیے ہوں۔ ان میں چند ایم اے صابر تلشیری، موسیٰ ناصح، عبدالکریم اخترؔ، ابراہیم سلیمان سیٹھ کوثرؔ، اسحٰق فقیر جیسے شعرا بھی ہیں جنہوں نے اپنی شعر و شاعری سے کیرلا کے اہل ذوق کی نمائندگی کی وہیں سید محمد سرورؔ اور زلیخا حسین جیسے ادیب بھی ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات، اپنی زبان دانی اور صلاحیت فن کے بل پر اہل زبانوں سے بھی ستائش حاصل کی۔

سید محمد سرورؔ اردو کے ایک کہنہ مشق شاعر، مترجم اور بہترین استاد تھے۔ ان کی پیدائش 13 جون 1916ء کو کیرلا کے مشہور شہر کوچین کے قریب 'کاٹور' نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی تھی۔ بچپن ہی میں انہوں نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی کی بھی تعلیم حاصل کر لی تھی لیکن اردو زبان سے ان کی آشنائی بہت بعد میں ہوئی۔ عنفوانِ شباب میں اردو زبان سے آشنائی اور اس سے محبت نے انہیں وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ بنگلور اور مدراس میں انہوں نے اردو کی اعلیٰ اور بہتر تعلیم حاصل کی۔ مولانا حبیب اللہ ندوی، محویؔ صدیقی اور جوہرؔ صاحب کی صحبت اور شاگردی نے ان کے اندر کے شاعر کو جگایا۔ محویؔ صدیقی اور جوہرؔ صاحب کے مشورے سے ہی انہوں نے اپنا تخلص سرورؔ متعین کیا تھا۔ 1940ء میں پہلی بار انہوں نے اپنے استاد محویؔ صدیقی کے ساتھ بنگلور کے مشاعرے میں اپنی نظم ''وادی ایمن'' پیش کیا، جس کا یہ شعر ان کی تخلیقی صلاحیت کی دلیل پیش کرتا ہے:

گل و غنچہ میں یہ صنعت نظر آتی نہیں مجھ کو
''کسی نقاش نے کھینچا ہے نقش اس کے جوبن کا''

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1942ء میں وہ کیرلا واپس لوٹے اور اپنی زندگی اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دی۔ ایک استاد کی حیثیت سے انہوں نے پہلے

مضامین

تلشیری کے برنن کالج اور سینٹ جوزف ہائی اسکول میں پھر ملاپورم گورنمنٹ اسکول میں تقریباً تیس سال تک اپنے خدمات انجام دیے۔ 1971ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ اردو کی اشاعت کے لیے سرگرم عمل رہے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے گھر کے قریب ایک عمارت بھی تعمیر کی جس کا نام انہوں نے ''اردو اکیڈمی'' رکھا۔ یہاں اردو کی درس و تدریس کا انتظام کیا گیا تھا بعد میں اسے اورینٹل لائبریری میں تبدیل کرلیا گیا۔ سرورؔ صاحب کی ہی کوششوں کے نتیجے حکومت کیرلا نے اردو تعلیم و تدریس کی طرف توجہ دی اور کیرلا کی آنے والی نسلوں کو اردو زبان و ادب کی درس و تدریس کی راہ ہموار ہوئی۔

سرورؔ صاحب اپنے زمانۂ تعلیم میں ہی اردو شعر و ادب کی طرف راغب ہو چکے تھے۔ ان کے کچھ ابتدائی لوک کہانیاں بجنور کے ایک رسالے ''خم جام'' میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد ان کی کئی نظمیں اور غزلیں رفتہ رفتہ کئی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہیں جن کے منتخب اشعار کو یکجا کر کے انہوں 1970ء میں اپنا پہلا شعری مجموعہ ''ارمغان کیرلا'' شائع کیا۔ بقول محوی صدیقی، یہ اردو کی پہلی کتاب ہے جو ایک مورثی اور آبائی ملاباری کی زبانِ قلم کا دلچسپ اور قابل شاہکار ہے۔ 1988ء میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''نوائے سرورؔ'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں ان کے پہلے مجموعے ''ارمغان کیرلا'' کی منتخب نظموں کو بھی شامل کرلیا گیا تھا۔ انہوں نے شاعری کے علاوہ ترجمے کے میدان میں بھی اپنی صلاحیت دکھائی ہے۔ اردو اور ملیالم زبان میں برابر مہارت رکھنے کی وجہ سے انہوں نے کئی ملیالم افسانوں کا اردو میں اور اردو افسانوں کا ملیالم میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر کئی مضامین بھی لکھے۔

سید محمد سرورؔ علامہ اقبالؔ کے بڑے پرستار تھے۔ سرورؔ کا پہلا شعری مجموعہ اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ان کا ''ارمغان کیرلا'' اقبال کے ''ارمغان حجاز'' سے ہی متاثر نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے نظموں کی موضوعات اور انتخاب الفاظ بھی اقبال کی پیروی کی واضح دلیل ہے۔ ان کے دوسرے مجموعے ''نوائے سرورؔ'' میں اقبال پر ایک نظم ہے۔ اس کے علاوہ 'جنت میں مکالمۂ اقبال و رومی' اور 'جواب اقبال' کے نام سے دو نظم ہیں جن میں اقبال کے شکوہ جواب شکوہ کا انداز اور اقبال کا مکالماتی پیرایۂ اظہار منعکس ہوتے ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ 'شانِ مومن'، 'عقل و دل کا مکالمہ'، 'حیاتِ جاوید اں'، 'بچوں کی دعا'، 'جگنو'، 'سرمدی آواز' اور 'وادی ایمن' جیسی نظموں میں اقبال کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظم 'جگنو' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سورج کی جب یہ بتی بجھتی ہے آسماں پر
ہستی سے تیری رونق بڑھتی ہے اس جہاں کی
کیوں تجھ کو یہ ستارے حیرت سے گھورتے ہیں
تاروں کی طرح تو بھی زینت تھا آسماں کی؟
ننھا سا ماہ پارہ یا ہے کوئی شرارہ
حیراں خرد ہے تجھ پر فطرت کے رازداں کی

مضامین

سید محمد سرورؔ کی شاعری میں سب سے نمایاں پہلو حب وطن ہے۔ ان کی نظم 'کیرلا' میں انہوں نے ریاست کیرلا کی خوبصورتی، کیرلا میں پائے جانے والے مصالحے، ناریل اور کاجو کے پیڑ اور یہاں کی ندیوں اور آب جووں کا بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کی اس نظم کے سارے اشعار قابلِ ذکر ہیں لیکن یہاں صرف ان اشعار کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جن میں ان کا روزِ بیان نمایاں نظر آتا ہے۔

ہند کی انگشتری کا ہے نگینہ کیرلا
ہے کئی اشیائے نادر کا خزینہ کیرلا
ہے یہاں کی گول مرچ کی ثنا خواں ہر زباں
جس کے ہر خوشے سے ہوں شرمندہ اعناب جناں
ساگ و شیشم کی وہ رونق آب و تاب آبنوس
پیش کر سکتی ہے کیونکر سر زمینِ چین و روس
ناریل کے پیڑ صف باندھے کھڑے ہیں اس طرح
عید گاہوں میں ہوں صف بستہ نمازی جس طرح
ہیں ترنگوں کے مسافر کارواں در کارواں
خلد آسا، جانفزا، وجد آفریں و کیف بار
ہر سماں رکھتا ہے دامن میں عجب شان بہار
تم کہو کشمیر کو ''فردوس بر روئے زمیں''
میں کہوں ہے کیریلا فردوس سے بڑھ کر کہیں
جو کوئی آتا ہے سرورؔ کیرلا میں ایک بار
وہ بھلا سکتا نہیں اس کی فضائے خوشگوار

سید محمد سرورؔ کے مندرجہ بالا اشعار ریاست کیرلا کی خوبصورتی اور یہاں آب و فضا کی خوشگواری کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی یہ نظم اردو ادب پڑھنے اور سمجھنے والے اہل کیرلا کے لیے سبب صد افتخار ہے۔ انہوں نے اس نظم میں بڑے ہی خوبصورت تشبیہ و استعاروں کا استعمال کرتے ہوئے کیرلا کو کشمیر سے بڑھ کر کہا ہے۔ ان کی اس نظم میں بھی علامہ اقبال کا سا انداز نمایاں ہے۔ اقبال کی نظموں میں جس طرح کی تغزل اور نغمگی پائی جاتی ہے ٹھیک اسی طرح سرورؔ کے ان اشعار میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

سید محمد سرورؔ کی نظموں کا سب اہم موضوع مسلمان اور ایمان ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سچے مسلمان اور اقبال کی ہی طرح عالم اسلام کے مسلمانوں کے لیے اپنے سینے میں درد رکھنے والے شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی نظم 'جواب اقبال'، جو کہ دراصل ان کی نظم 'جنت میں مکالمۂ اقبال و رومیؒ' کا دوسرا حصہ ہے، میں کئی ایسے اشعار پیش کیے ہیں جن سے موجودہ مسلمانوں کی خستہ حالی اور ان کے زوال کے اسباب عیاں ہوتے ہیں:۔

ابھی چشم مسلماں میں نہیں آئی ہے بینائی
ہراساں لن ترانی سے ہے اب بھی شان سینائی
تن مسلم ہے گو زندہ مگر مردہ ضمیر اس کا
تن آسانی و غفلت سے مرکب ہے خمیر اس کا
لرزتے قیصر و کسریٰ تھے جن کے اک اشارے پر
وہی اب جی رہے ہیں اہل باطل کے سہارے پر
ذرا سی جاہ کی خاطر وفا سے ہاتھ دھو بیٹھے

مضامین

نبی سے ہاتھ دھو بیٹھے خدا سے ہاتھ دھو بیٹھے
صداقت ہے نہ غیرت ہے شجاعت ہے نہ خودداری
جبلت ہے آج مسلم کی ہے مکاری و عیاری

سید محمد سرورؔ نے اپنے دور کی سیاسی وسماجی صورتحال سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ فلسطین پر اسرائیل کے قبضے کی خبر نے انہیں بہت غم زدہ کر دیا تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنی دو نظموں میں کیا ہے۔ 'جواب اقبال' میں انہوں نے اس کا افسوس ظاہر کیا ہے ساتھ اسی حادثے پر ایک نظم بعنوان 'بیت المقدس پر یہودیوں کے قبضہ سے متاثر ہوکر' لکھی۔ 'جواب اقبال' میں وہ اس واقعے پر اپنے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جہاں خالق کی پیاری ہستیاں آرام کرتی ہیں
تقدس کے ترانوں میں جو صبحیں شام کرتی ہیں
یہودیت کی لعنت اس جگہ فرماں رواں اب ہے!
مقدس سرزمیں میں آہ لعنت کی صدا اب ہے!

وہیں اپنی نظم 'بیت المقدس پر یہودیوں کے قبضہ سے متاثر ہوکر' کے ذریعے میں وہ مسلم نوجوانوں کو بیدار کرتے اور صہیونی طاقتوں کے خلاف یکجا ہونے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔

اُٹھ خس وخاشاک صہیونی سے گلشن پاک کر!
زندہ پھر آفاق میں وہ سطوت لولاک کر!
غیرتِ سبطِ نبی ﷺ کی شان پھر بیدار ہو
ذو الفقاری عزم کی حامل تری تلوار ہو
ضرب ہو کاری تری بھرپور تیرا وار ہو
پھر صلاح الدین سا پیدا کوئی سالار ہو

اس کے علاوہ ان کی نظموں میں ہندوستان کی موجودہ صورتحال پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی نظم 'کیا یہی ہے وہ ہندوستان' میں ملک میں بڑھ رہی فرقہ واریت اور آپسی رنجشوں کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستان کی عظمت رفتہ کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان کی سیاسی بحران، سماجی اقدار کی پامالی اور انسانیت کے زوال پر سوال اٹھاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا یہی وہ ہندوستان جس پر ہمیں ناز تھا؟

دگر گوں ہو گیا ناگاہ اب رنگ چمن یکسر
وطن نازاں تھا جن پر آج ہیں ننگ وطن یکسر
ہے عاری زیورِ اخلاق سے ہر مرد و زن یکسر
بھرا ہے ہر بشر کا زہر سے کام و دہن یکسر
یہی ہے کیا وہ ہندوستاں جو رشک صد گلستاں تھا؟

سید محمد سرورؔ کے دوسرے مجموعے ''نوائے سرورؔ'' میں نظموں کے علاوہ ایک غزل، بچوں کے لیے لکھی گئی پانچ نظمیں اور چار شخصی مرثیے بھی ہیں۔ ان شخصی مرثیوں میں ان کا اپنی والدہ مرحومہ کے لیے لکھا گیا مرثیہ، اقبالؔ کے مرثیے 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کی یاد دلاتا ہے۔ بھلے ہی سرورؔ کا مرثیہ اقبالؔ کے انداز سے مختلف کیوں نہ ہو لیکن موضوع کی یکسانیت کی وجہ سے اس مرثیے میں بھی اقبال کی تاثیر واضح نظر آتی ہے۔ 'آہ اماں' کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

آباد تھا جہاں مرا تیرے دم سے ماں!
لبریز دل کا جام ہے اب تیرے غم سے ماں
رو رو کے آنکھ ہوگئی محروم نم سے ماں!
مردہ ہوا ہے دل مرا رنج و الم سے ماں!
روح و جگر میں آتش فرقت سما گئی

سید محمد سرورؔ کی شاعری سے متاثر ہوکر اردو کے نامور ادیبوں نے ان کی شعری صلاحیت کا اعتراف کیا۔ ''ارمغان کیرلا'' کی اشاعت کے بعد ہندوستان کے کئی اردو ادیبوں نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے مجموعے پر تبصرہ کیا۔ ساغر مہدی اس موقعے پر لکھتے ہیں:

''اس اردو کش دور میں آپ کی خدمات لائق ستائش اور قابل قدر ہیں کہ آپ نے ایسے علاقوں میں اردو کا چراغ روشن کیا جہاں اردو جاننے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔''

وہیں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب فرماتے ہیں:

''یہ مجموعہ کلام صالحہ جذبات، عالی فکر اور بیدار مغزی کی بھرپور مثال ہے دردمندی اور انسان دوستی ہر صفحہ پر نمایاں ہے زبان و بیان پر قدرت تو ظاہر ہی ہے۔ یقین ہے آپ کی شاعری نکھری سنورتی جائے گی۔''

اسی کا نتیجہ تھا کہ انہیں 1988ء میں اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے ان کے دوسرے مجموعے پر انہیں مالی تعاون اور سند حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر اے محمد ابراہیم ''نوائے سرورؔ'' کے تعارف میں انگریزی کے مشہور ادیب جوزف کانراڈ سے سید محمد سرورؔ کی مشابہت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جس طرح جوزف کانراڈ کی خوابوں کی زبان پولش، تصورات کی زبان فرانسیسی اور تصنیفی و تحریری زبان انگریزی ہے اسی طرح سید محمد سرورؔ کی مادری زبان ملیالم، تصورات کی زبان عربی اور تحریری زبان اردو ہے۔ اسی طرح پیش لفظ میں پروفیسر شارب ردولوی صاحب سید محمد سرورؔ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''ان کی حیثیت شاعر اور مترجم سے زیادہ بڑی ہے۔ میری نگاہ میں وہ کیرلا کے ''بابائے اردو'' ہیں۔''

الغرض، کیرلا میں اردو زبان وادب کی ترقی و ترویج میں سید محمد سرورؔ کی خدمات کا سبھی بخوبی اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن آج بھی ان کی کئی نظمیں اور خاص کر ان کے نثری کارنامے عام قاری کے دستیاب نہیں۔ اہل کیرلا اور محبان اردو کی ذمے داری بنتی ہے کہ ایسی شخصیت کی خدمات اور ان کے کارناموں کو وقت کی لہر میں کھونے نہ دیں اور انہیں تمام محبان زبان تک پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کریں۔

☆☆☆

محمد امان اے کے
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
یونی ورسٹی آف کالی کٹ، کیرلا
موبائل: +91-8897246842

مضامین

عفت موہانی۔اردو فکشن نگاری کا ایک مقبول نام

حیدرآباد کی ادبی خواتین کے حلقہ میں عفت موہانی کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔وہ ایک کامیاب فکشن نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں ۔ان کے ناول اور افسانے ۷۰ اور ۸۰ کی دہائیوں میں کافی مشہور ہوئے ۔ ان کے مضامین بھی کافی شوق سے پڑھے جاتے تھے ۔

عفت موہانی کا اصلی نام خورشید سلطانہ ہے ۔ وہ ۲۴ جولائی ۱۹۳۷ کو اتر پردیش کے قصبہ موہان ضلع امروہہ میں پیدا ہوئیں ۔ والد کا نام سید بشار احمد رضوی ہے۔عفت موہانی قلمی نام ہے جو کہ مشہور شاعر حسرت موہانی کا دیا ہوا ہے ۔ان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی ، میٹرک انٹر اور گریجویشن اعلیٰ نشانات سے کامیاب کیا ۔ عثمانیہ یونیورسٹی آرٹس کالج سے ایم اے اور بی ایڈ کی ڈگری لی ۔انھوں نے ایک کامیاب فکشن نگار کے طور پر اپنے آپ کو منوایا ۔ناول نگاری اور افسانہ نگاری ان کا محبوب مشغلہ تھا انھوں نے چند مضامین بھی تحریر کئے ہیں ۔ انھیں بچپن ہی سے کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا ان کے ادبی سفر کا آغاز آٹھ سال کی عمر میں ہوا۔وہ ماہنامہ ''میزان'' کے لئے بچوں کے صفحے میں کہانیاں لکھتی تھیں ۔ جو کہ نسیم انہونوی کی ادارت میں لکھنو سے شائع ہوتا تھا۔بعد میں انھیں کی ایماء پر ناول نگاری کی ابتداء کی ۔ ان کا پہلا ناول ''ستم کے سہارے'' نسیم انہونوی نے ماہ نامہ حریم میں قسط وار شائع کیا ۔بعد میں ۱۹۷۱ء میں یہ ناول کتابی شکل میں شائع ہوا۔اس کے بعد انھوں نے متواتر ۸۴ ناول لکھے اور کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ان کی ناول نگاری کے لئے اتر پردیش اردو اکیڈیمی کی جانب سے انھیں ایوارڈ عطا کیا گیا۔آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی جانب سے بھی انھیں بیسٹ اردو فکشن رائیٹر کا ایوارڈ عطا کیا گیا۔ان کے تقریباً سارے ہی ناول نسیم بک ڈپو لکھنو سے شائع ہوئے ۔

وہ اپنی ناولوں میں صاف ستھری اور نکھری ہوئی زبان کا استعمال کرتی ہیں ۔گنجلگ اور مشکل ہندی سے گریز کرتی ہیں ۔ انھوں نے اپنی ناولوں کے ذریعہ خواتین کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔حالانکہ ان کی پیدائش اتر پردیش کی ہے لیکن وہ حیدرآبادی تہذیب کی دلدادہ ہیں اور اپنی ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ انھوں نے خوب شہرت حاصل کی ۔نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان کے باہر بھی ان کے ناول کافی شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ان کا آخری ناول ''شفق کے سایے'' ۱۹۹۵ء میں نسیم بکڈپو سے شائع ہوا۔اس کے بعد انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا۔

۲۰۱۵ء میں شکاگو میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں ۔

مضامین

ان کے چند ناول یہ ہیں: ستم کے سہار، محبت نام ہے غم کا، درد و درماں، بے زبان، بزدل، ہم تو جئے ہیں تیرے لئے، آہوں کے گیت، شہر آرزو، سزاء، صنم، لے نام بھی آہستہ، فاصلے اور منزل وغیرہ وغیرہ ہیں۔ عفت موہانی کی ناول نگاری کا مقصد اصلاحِ معاشرہ ہے۔ اپنی کہانیوں کے تعلق سے مصنفہ خود لکھتی ہیں:

''میری کہانیاں ہمیشہ تعمیری ہوتی ہیں۔ جنہیں دوسرے الفاظ میں مقصدی بھی کہا جاسکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ ایثار و شرافتِ نفس کی کہانیاں لکھی ہیں۔''

(اپنی کہانی اپنی زبانی۔ ماہ نامہ۔ صبا۔ 1997)

عفت موہانی اپنی ناولوں میں نہایت سادہ، دلکش اور سلیس اردو کا استعمال کرتی ہیں۔ ان کی ناولوں میں ہمیں فطرت کا عکاسی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنی ناولوں میں حقیقت سے قریب کرداروں کو پیش کیا ہے۔ کہانی پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ جتنے بھی کرداروں کو وہ پیش کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ انصاف کرتی ہیں۔ اور ہر کردار کو اس کے انجام تک پہنچا کر ہی دم لیتی ہیں۔ ناول چاہے کتنا بھی طویل ہو۔ کرداروں کو جوڑے رکھتی ہیں۔ ناول کے ختم ہونے تک دلچسپی کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ ناولوں کے کردار اکثر گھریلو قسم کے ہوتے ہیں اور گھر کی چار دیواری کے اندر ہونے والے واقعات کو لیکر وہ ناول تحریر کرتی ہیں۔ ان کی ناولوں میں ہیرو شریف اور پاکباز ہوتے ہیں لیکن اکثر ڈرپوک، بزدل اور بے ہمت بھی ہوتے ہیں۔ لڑکیاں (ہیروئن) مشرقی اقدار، شرم وحیاء والی اور تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ناولوں کے ذریعہ زندگی کی اعلیٰ قدروں پر عمل کرنے کا سبق دیتی ہیں۔ جدیدیت کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن ان کا قلم بے لباس نہیں ہوتا۔ عریانیت اور فحاشی سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مشہور و معروف نقاد احتشام حسین نے ماہنامہ نکہت الہ آباد میں عفت کے متعلق لکھا تھا:

''نئی ابھرنے والی قلم کاروں میں صرف عفت ہی وہ واحد قلم کار ہے جس کے قلم پر عریانی کا سایہ نہیں پڑا۔''

(تحریری انٹرویو۔ بذریعہ خط و کتابت۔ لکھنو۔ جون 1999ء)

ان کی اکثر ناولوں میں ہیرو انتہائی وجیہ، خوبصورت، تعلیم یافتہ اور اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھنے والا ہوتا ہے۔ ہیروئنیں اس پر جان چھڑکتی ہیں۔ اکثر ناولوں میں ہمیں ہیرو کا نام ''خالد'' ملتا ہے۔ یہ ایک اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔

عفت موہانی ادب برائے زندگی کی ترجمان ہیں۔ انہوں نے اپنی ناولوں میں سماجی، معاشرتی، نفسیاتی مسائل کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی کو بھی پیش کیا ہے۔

ان کی نظر میں ادب کا مقصد ''رومانیت'' ہے۔ وہ ایسے کرداروں کو پیش کرتی ہیں جس میں کسی کا مقصد ''کسی کو پانا'' ہوتا ہے۔ یا کسی کا ہوجانا ہوتا ہے۔ ہیرو اور

مضامین

ہیروئن کا اصل مقصد شادی ہوتا ہے۔ اگر عشق ناکام ہو جائے تو وہ اکثر کرداروں کو موت کی نیند سلا دیتی ہیں۔

عفت موہانی نہ صرف ایک کامیاب ناول نگار ہیں بلکہ افسانہ نگاری میں بھی انہوں نے شہرت حاصل کی۔ ان کے افسانوں میں بھی سماجی، معاشرتی اور نفسیاتی مسائل ملتے ہیں۔ انکا پہلا افسانہ ''تماشہ'' 1965ء میں ماہنامہ بیسویں نئی دہلی سے شائع ہوا۔ ان کے افسانے زیادہ تر پاکیزہ آنچل نئی دہلی۔ ماہنامہ پونم حیدرآباد سے شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ماہ نامہ ''صبا'' میں بھی ان کے افسانے قسط وار شائع ہوئے۔ جن میں قابل ذکر سوائی۔ محبت کی راہیں اور پیاسا وغیرہ ہیں۔

انہوں نے تقریباً 30 افسانے لکھے اور 3 ناولٹ بھی تحریر کئے۔ جن میں چند افسانوں کے نام یہ ہیں۔ تماشا، سودائی، محبت کی راہیں، پیاسا، گھروندے۔

اس کے علاوہ ہمیں ان کے لکھے ہوئے ''ناولٹ'' میں محبت کی راہیں، واپسی، مری اک عمر تجھ سے وابستہ، ہیں جو ماہنامہ'' پاکیزہ آنچل'' نئی دہلی سے شائع ہوئے۔ عفت موہانی نے فکشن نگاری میں بہت نام کمایا۔ تقریباً اُردو رسائل میں آپ کے افسانے اور ناول قسط وار چھپتے رہے۔ ڈائجسٹ پڑھنے والوں میں عفت موہانی کا نام کافی مقبول تھا۔ اتنی زیادہ تعداد میں ناول اور افسانوں کا ملنا یہ بتاتا ہے کہ وہ لگاتار لکھتی رہیں۔ ان کی تحریروں میں روانی ہوا کرتی تھی۔ افسانوی نثر کے علاوہ غیر افسانوی نثر میں بھی عفت موہانی طبع آزمائی کرتی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے کئی مضامین لکھے۔ انہوں نے عام طور پر سماجی، نفسیاتی موضوعات پر مضامین تحریر کئے ہیں۔ ان کے مضامین ماہنامہ حریم۔ ماہنامہ صبا اور روزنامہ سیاست میں بھی چھپ چکے ہیں جن میں چند یہ ہیں:

۱۔ ''علوی صاحب ایک منفرد اور صاحب طرز مترجم'' ماہنامہ سرپنچ لکھنو''

۲۔ صنفِ نازک علامہ اقبال کی نظر میں''۔ پونم۔ حیدرآباد'

۳۔ ''1967ء'' ایک یادگار سال۔ ارمغانِ خالد'

۴۔ 'سفرلکھنو کے تاثرات'۔ ماہنامہ مریم' لکھنو' ماہ جون

الغرض عفت موہانی اُردو دنیا کا ایک مقبول نام ہے۔

☆☆☆

حمیدہ بیگم

ریسرچ اسکالرس' پی ایچ۔ڈی اردو
عثمانیہ یونیورسٹی
مکان نمبر: 10-3-803, 205/2RT' وجے نگر کالونی
مانصاحب ٹینک' حیدرآباد۔ 500057
فون: 9885662691 '9848249094
ای میل: hamidabegum36@gmail.com

مضامین

ہائیڈروجن فیول سیل گاڑیاں-ہائیڈروجن اور ہوا سے بجلی پیدا کرنا| یہ کیسے کام کرتا ہے

سائنسی مضمون

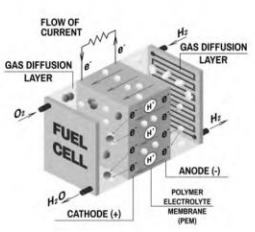

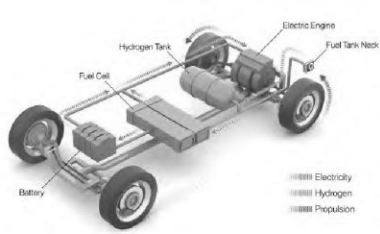

ہائیڈروجن فیول سیل (ایندھن کے خلیے) بس کی نقاب کشائی: مقامی طور پر تیار کردہ ہائیڈروجن فیول سیل بس کی نقاب کشائی اتوار 21 اگست 2022 کو پونے میں کی گئی۔ اس بس کو کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (CSIR) اور نجی فرم KPIT لمیٹڈ نے تیار کیا ہے۔ ہائیڈروجن فیول سیل بس ہائیڈروجن اور ہوا سے چلتی ہے۔ اس بس کو نیشنل گرین ہائیڈروجن مشن کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ بس سے کوئی گیس خارج نہیں ہوتی بلکہ صرف پانی کا اخراج ہوتا ہے۔

اس وجہ سے یہ ممکنہ طور پر سب سے زیادہ ماحول دوست نقل وحمل کا ذریعہ ہے۔ فیول سیل ٹرکوں اور بسوں کے آپریشنل اخراجات روپے فی کلومیٹر، ڈیزل سے چلنے والی گاڑیوں سے کم ہیں، فیول سیل گاڑیوں کی اعلی کارکردگی اور ہائیڈروجن کی اعلی توانائی کی کثافت اسی بات کو یقینی بناتی ہے۔ فیول سیل گاڑیاں صفر گرین ہاؤس گیسس کا اخراج کرتی ہیں۔ ہائیڈروجن فیول سیل بس اس سیکٹر سے سڑک پر ہونے والے اخراج کو ختم کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ چونکہ ڈیزل سے چلنے والی بھاری کمرشیل گاڑیوں سے CO2 کا اخراج 12-14% ہوتا ہے۔ اور ذرات کا اخراج ہوتا ہے۔ اس کو کم کرنا ایک چیلینج سے کم نہیں۔ یہ الیکٹریکل، ہائیڈروجن فیول سیل اور متبادل ایندھن جیسے ایتھنول، میتھانول، بائیوڈیزل، بائیوسی این جی، بائیوایل این جی اور ہائیڈروجن کے استعمال سے ہی ممکن ہے۔

ہائیڈروجن فیول سیل سے چلنے والی بس سے نکلنے والے اخراج کا ذائقہ ڈسٹل واٹر جیسا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ پانی ہے۔ خالص ہائیڈروجن استعمال کرنے والے فیول سیل کوئی فضائی آلودگی یا گرین ہاؤس گیسیں خارج نہیں کرتے، صرف پانی کے بخارات خارج کرتے ہیں۔ ہائیڈروجن فیول سیل ہماری گاڑیوں، گھروں اور دفاتر کو زیادہ موثر طریقے سے بجلی فراہم کرنے کا وعدہ کرتے ہیں اور روایتی توانائی کے ذرائع کے مقابلے ماحول کے لیے کم نقصان دہ ہوں گے۔ اس ٹیکنالوجی کی موجودہ حالت کیا ہے اور اس صاف، قابل تجدید توانائی کے وسائل کو استعمال کرنے کے ہمارے راستے میں کیا رکاوٹ ہے، تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

ہائیڈروجن کیا ہے؟: ہائیڈروجن تمام کیمیائی عناصر میں سب سے آسان اور ہلکا ہے، یہ پانی اور نامیاتی مادے سمیت کئی جگہوں پر پایا جاسکتا ہے۔ اپنی عام گیسی حالت میں ہائیڈروجن بے رنگ، بو کے بغیر، بے ذائقہ اور غیر زہریلا ہوتا ہے۔ ہائیڈروجن پانی میں 11.11٪ اور ہوا میں 0.00005٪ پایا جاتا ہے۔

فیول سیل کیا ہے؟: فیول سیل ایک ایسا آلہ ہے جو ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ایک خاص عمل میں ملا کر پیدا ہونے والی کیمیائی توانائی لیتا ہے اور اسے برقی رو میں بدل دیتا ہے۔ ہر ایک فیول سیل سے پیدا ہونے والے چارج کی مقدار بہت ہی کم ہوتی ہے، لہذا فیول سیل چادروں میں بنائے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اسٹیک (ڈھیر میں منسلک) ہوتے ہیں تاکہ موٹر کو طاقت دینے کے لیے کافی برقی رو (بجلی) پیدا کیا جاسکے۔ فیول سیل سے چلنے والی گاڑی کی ایک سادہ ترتیب ایک ٹینک سے شروع ہوتی ہے جس میں پریشرائزڈ ہائیڈروجن ایندھن ہوتا ہے، یہ ٹینک براہ راست فیول سیل سے جڑا ہوتا ہے۔ فیول سیل ہائیڈروجن کو برقی میں تبدیل

کرتے ہیں۔اور موٹر کو بجلی فراہم کرتے ہیں۔

کیا ہائیڈروجن فیول سیل نظام آسانی سے دستیاب ہو جائیں گے؟: ہائیڈروجن ایندھن کو حیاتیاتی ایندھن(Fossil Fuel) کی جگہ لینے سے پہلے بہت سی رکاوٹیں ہیں جن پر قابو پانا ضروری ہے۔ پانی جیسے وافر ذرائع سے ہائیڈروجن نکالنا مشکل اور مہنگا ہوسکتا ہے۔ ہائیڈروجن کو محفوظ طریقے سے اور مؤثر طریقے سے ذخیرہ کرنا ایک مسئلہ ہے اور صارفین کی متوقع قیمت اب بھی بہت زیادہ ہے۔ اب تک سب سے بڑی رکاوٹ موجودہ پٹرول کے بنیادی ڈھانچے (ایندھن اکٹھا کرنے، اسے گیس اسٹیشنوں اور پھر آپ کی گاڑی تک پہنچانے کا نظام) کو ہائیڈروجن انفراسٹرکچر میں تبدیل کرنا ہوگا۔

حکومتوں اور کاروباری اداروں کی تحقیق اور تعاون کی بدولت ہائیڈروجن فیول سیل ٹیکنالوجی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ لیکن اس بڑی تبدیلی کے لیے پورے معاشرے کے تعاون کی ضرورت ہے۔ صاف ستھرے ماحول کے فوائد اور تیل (پٹرول/ڈیزل) پر ہمارا انحصار کم کرنا دو اہم وجوہات اس نئی ٹیکنالوجی کو اپنانے میں مدد فراہم کرسکتی ہیں۔

الیکٹرک گاڑیوں سے ہائیڈروجن سے چلنے والی کاروں تک؟: اگلی نسل کی گاڑیاں جو کم نقصان دہ مادے اور کم شور پیدا کرتی ہیں، ایک عالمی اہداف ہیں، اور اس کے نتیجے میں پوری دنیا الیکٹرک گاڑیوں (EVs) کے ساتھ تجربات کر رہی ہے۔ الیکٹرو موبیلٹی سیکٹر سے الیکٹرک گاڑیوں کی ایک خرابی ان کا طویل چارجنگ وقت ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ہائیڈروجن فیولنگ سے حل کیا جاسکتا ہے، جسے سیل فیولنگ بھی کہا جاتا ہے۔ ہائیڈروجن سیل اسی توانائی کا استعمال کرتے ہیں جو خلائی جہاز زمین کے مدار تک پہنچنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

ہائیڈروجن گاڑی کا ہارڈ ویئر: ہائیڈروجن گاڑیاں کیمیائی توانائی کو مکینیکس (حرکی توانائی) میں تبدیل کرتی ہیں۔ ایک ہائیڈروجن انٹرنل کمبشن انجن وہیکل (HICEV) (ہائیڈروجن پر مبنی اندرونی احتراقی انجن گاڑی) روایتی احتراقی انجن کو استعمال کرتی ہیں جس میں ہائیڈروجن بطور ایندھن استعمال ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہائیڈروجن اور آکسیجن کا استعمال فیول سیل میں بھی کیا جا سکتا ہے، جس سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی گاڑی کو فیول سیل الیکٹرک وہیکل (FCEV) کہا جاتا ہے، اور حالیہ برسوں میں کئی کمپنیاں اس طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ اور FCEVs پر تحقیق کر رہی ہیں۔ FCEVs میں ہائیڈروجن کی پیداوار اور اس کے انتظام کے لئے ایک آن بورڈ پاور پلانٹ ہوتا ہے، جس سے بروقت ہائیڈروجن حاصل ہوتا ہے۔ ہائیڈروجن کی مدد سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اور الیکٹرک موٹر کے استعمال سے گاڑی حرکت کرتی ہے۔ FCEVs کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ ماحول دوست ہوتی ہے۔ یہ آلودگی پھیلانے والے اخراج کو پیدا نہیں کرتی ہیں۔ گرین ہاؤس گیسوں اور باریک ذرات کے بجائے، وہ پانی کے بخارات خارج کرتے ہیں۔ تاہم ہائیڈروجن سے نقل و حرکت کا مجموعی ماحولیاتی اثر اس کی پیداوار کے لیے استعمال ہونے والے توانائی کے منبع پر منحصر ہے۔ ہائیڈروجن کائنات میں وافر مقدار میں پایا جانے والا کیمیائی عنصر ہے، لیکن قدرتی شکل میں نہیں یعنی یہ خالص نہیں ہوتی، اس کو مختلف طریقوں سے پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ ہائیڈروجن پیدا کرنے کے لیے قابل تجدید توانائی کے ذرائع استعمال کرتے ہیں، تو ماحولیاتی اثرات کم سے کم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر حیاتیاتی (فوسل) ذرائع استعمال کیے جائیں تو ماحولیاتی اثرات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

ہائیڈروجن دو پیداواری عمل اور ٹیکنالوجیز کے ذریعے تیار کی جاسکتی ہے۔

1۔ ریفام۔ دوبارہ تشکیلی طریقہ (ہائیڈروکاربن کی دوبارہ تشکیل)

2۔ الیکٹرولیسس۔ (برق پاشی۔ برقی رو کے ذریعہ تحلیل کرنا)

دوبارہ تشکیلی طریقہ میں ماحولیاتی اثر زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس میں خام تیل نکالنا، نقل و حمل اور ریفائننگ شامل ہوتی ہے۔

الیکٹرولیسس (برق پاشی) طریقہ میں H2O پانی کے سالمہ کو بجلی کے ذریعے پیدا ہونے والے کیمیائی ردعمل کے ذریعے تحلیل کیا جاتا ہے۔ اور اس عمل میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کے جوہر علیحدہ ہوتے ہیں۔ الیکٹرولیسس عمل میں کم اولٹیج بجلی کو پانی میں گزارا جاتا ہے، جس سے ہائیڈروجن اور آکسیجن گیس کی شکل میں علیحدہ ہوتی ہے۔ یہ پیداواری عمل آلودگی پھیلانے والی گیسوں کا اخراج نہیں کرتا لیکن اس پورے عمل کے لئے بڑی مقدار میں بجلی درکار ہوتی ہے۔

فیول سیل میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بجلی پیدا کرتے ہیں، جو الیکٹرک موٹر اور بیٹری تک پہنچائی جاتی ہے۔ ہائیڈروجن کی خصوصیات میں سے ایک اس کی بہت زیادہ

مخصوص توانائی کی کثافت، Wh40,000 / kg، یا236× لیتھیم آئن بیٹریوں کی مخصوص توانائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہائیڈروجن سے چلنے والی گاڑیاں بیٹری سے چلنے والی گاڑیوں سے ہلکی ہوتی ہیں اوران کی حد زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بیٹری سے چلنے والی کاروں کو ریچارج کرنے کے لیے کئی گھنٹے درکار ہوتے ہیں،لیکن ہائیڈروجن ایندھن بھرنے میں صرف چند منٹ لگتے ہیں۔

ہائیڈروجن فیول سیل کیسے کام کرتے ہیں؟: ہائیڈروجن فیول سیل گاڑیوں میں ریورس الیکٹرولیسس (معکوس برق پاشی) کا عمل ہوتا ہے۔ ہائیڈروجن ٹینک سے حاصل ہوتی ہے، ہوا (آکسیجن) اردگرد کے ماحول سے ملتی ہے۔ جب ان دونوں کو فیول سیل سے گزارا جاتا ہے تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔اور غیر تبدیل شدہ ہائیڈروجن اور آکسیجن سے فضلہ کے طور پر پانی کا اخراج ہوتا ہے۔ فیول سیل بیٹریوں کی طرح کام کرتے ہیں،لیکن وہ ختم نہیں ہوتے اور نہ ہی انہیں دوبارہ چارج کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک ایندھن (ہایئڈروجن) کی فراہمی ہوتی ہے وہ بجلی اور حرارت پیدا کرتے ہیں۔ ایک فیول سیل دو الیکٹروڈ (برقیرہ) پر مشتمل ہوتا ہے—ایک منفی الیکٹروڈ (یا اینوڈ) اور ایک مثبت الیکٹروڈ (یا کیتھوڈ)—اس کو ایک الیکٹرولائٹ کے گرد سینڈوچ کیا جاتا ہے۔ ایک ایندھن جیسے ہائیڈروجن، اینوڈ سے گزارا جاتا ہے، اور ہوا کو کیتھوڈ سے گزارا جاتا ہے۔ ہائیڈروجن فیول سیل کے اینوڈ میں ایک Catalyst (عامل غیر مبدل) ہوتا ہے جو ہائیڈروجن سالمہ سے پروٹان اور الیکٹران کو علیحدہ کرتا ہے۔ الیکٹران ایک بیرونی سرکٹ سے گزرتا ہے اور بجلی کا بہاؤ پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح پروٹان الیکٹرولایٹ سے گزرتے ہو؟ کیتھوڈ تک پہنچتے ہیں۔ جہاں پر وہ آکسیجن کے ساتھ مل کر حرارت اور پانی خارج کرتے ہیں۔ فیول سیلز میں پولیمر الیکٹرولائٹ میمبرین (PEM) پر تحقیق مرکوز کی گ ء ہے۔ PEM فیول سیلز مختلف اشیاء سے کئی پرتوں میں بنائے جاتے ہیں۔ PEM فیول سیل کے اہم حصے ذیل میں بیان کیے گئے ہیں۔ PEM فیول سیل کا دل میمبرین الیکٹروڈ اسمبلی (MEA) ہوتا ہے، جس میں جھلی (میمبرین)، Catalyst کی پرتیں، اور گیس کے پھیلاؤ کی پرتیں (GDLs) شامل ہیں۔ MEA فیول سیل کے اجزاء میں گیسکیٹ شامل ہیں، جو گیسوں کے رساؤ کو روکنے کے لیے MEA کے اردگرد ایک مہر (Seal) فراہم کرتے ہیں۔ ہر ایک MEA سے صرف 1V بجلی پیدا ہوتی ہے، زیادہ بجلی حاصل کرنے کے لئے کئی MEA کو سلسلہ وار ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر جوڑا جاتا ہے۔ اوران کے درمیان بائی پولر پلیٹیں (دو قطبی پلیٹس) کو رکھ کر سینڈوچ کیا جاتا ہے، تاکہ اسے پڑوسی سیلز سے علیحدہ کیا جاسکے، بائی پولر پلیٹیں ایندھن اور ہوا کو گزرنے کے ل؟ چینلز فراہم کرتی ہیں۔ اور سیلز کے درمیان برقی ترسیل کرنے کے ساتھ ساتھ اسٹیک کو مضبوطی فراہم کرتے ہیں۔

پولیمر الیکٹرولائٹ میمبرین یا PEM (جسے پروٹون تبادلہ میمبرین بھی کہا جاتا ہے)—ایک خاص مٹیریل سے تیار شدہ میمبرین ہوتا ہے، جو صرف پروٹانس یا مثبت چارج شدہ آئنوں کو گزرنے دیتا ہے اور الیکٹرانوں کو روکتا ہے۔ PEM فیول سیل ٹیکنالوجی کی کلید ہے۔ یہ میمبرین بہت پتلا ہوتا ہے جو 20 میکرون سے کم ہوتا ہے یہ اینوڈ اور کیتھوڈ کے درمیان صرف ضروری مثبت چارج شدہ آئنوں کو گزرنے دیتا ہے۔

فیول سیل میں پیدا ہونے والی بجلی براہ راست گاڑی کو طاقت دے سکتی ہے یا ایک بیٹری (روایتی بیٹری سے چھوٹی) کو چارج کرسکتی ہے، جو ایک درمیانی برقی جمع کرنے والے کے طور پر کام کرتی ہے۔ بیٹری سے بجلی برقی موٹر کو پہنچتی ہے جس سے گاڑی حرکت کرتی ہے۔ دوسری ہائبرڈ گاڑیوں کی طرح ہائیڈروجن سے چلنے والی گاڑیاں بھی بیٹری کو ری چارج کرنے کے لیے تھوڑی توانائی کا استعمال کرتی ہیں۔ بیٹری کا استعمال انجن کی توانائی کے ممکنہ مطالبات کو پورا کرنے اور بریک لگانے والی توانائی کو بحال کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، جیسا کہ الیکٹرک اور ہائبرڈ کاروں میں ہوتا ہے۔ فیول سیل کے ذریعہ تیار کردہ وولٹیج 600V تک ہونا چاہئے۔ کم رفتار پر، کار صرف بیٹری سے توانائی حاصل کرتے ہو؟ حرکت کرتی ہے۔ تیز رفتاری پر جیسے کہ ہائی وے پر، فیول سیل ایک ہی وقت میں بیٹری کو ری چارج کرتے ہوئے انجن میں اضافی طاقت لاتا ہے۔

محمد احمد خان، حیدرآباد
موبائل: 9848999241

☆☆☆

یہ پری چہرہ لوگ

کہانی کی کہانی:

ہر انسان اپنے مزاج اور کردار سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ سخت مزاج بیگم بلقیس طراب علی ایک دن مالی سے بیٹے کی صفائی کرا رہی تھیں کہ وہ مہترانی اور اس کی بیٹی کی بات چیت سن لیتی ہیں۔ بات چیت میں مالی بیٹی بیگموں کے اصل نام نہ لے کر انھیں مختلف ناموں سے بلاتی ہیں۔ یہ سن کر بلقیس بانو ان دونوں کو اپنے پاس بلاتی ہیں۔ وہ ان ناموں کے اصلی نام پوچھتی ہیں اور جاننا چاہتی ہیں کہ انھوں نے اس کا نام کیا رکھا ہے؟ مہترانی ان کے سامنے تو منع کر دیتی ہے لیکن اس نے بیگم بلقیس کا جو نام رکھا ہوتا ہے، وہ اپنے شوہر کے سامنے لے دیتی ہے۔

پت جھڑ کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ بیگم بلقیس تراب علی ہر سال کی طرح اب کے بھی اپنے بنگلے کے باغیچے میں مالی سے پودوں اور پیڑوں کی کانٹ چھانٹ کرا رہی تھیں۔ اس وقت دن کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ سیٹھ تراب علی اپنے کام پر اور لڑکے لڑکیاں اسکولوں کالجوں میں جا چکے تھے۔ چنانچہ بیگم صاحب بڑی بے فکری کے ساتھ آرام کرسی پر بیٹھی مالی کے کام کی نگرانی کر رہی تھیں۔

بیگم تراب علی کو نگرانی کے کاموں سے ہمیشہ بڑی دلچسپی رہی تھی۔ آج سے پندرہ سال پہلے جب ان کے شوہر نے جو اس وقت سیٹھ تراب علی نہیں بلکہ شیخ تراب علی کہلاتے تھے اور سرکاری تعمیرات کے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ اس نواح میں بنگلہ بنوانا شروع کیا تھا تو بیگم صاحب نے اس کی تعمیرات کے کام کی بڑی کڑی نگرانی کی تھی اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ بنگلہ بڑی کفایت کے ساتھ اور تھوڑے ہی دنوں میں بن کر تیار ہو گیا تھا۔

بیگم تراب علی کا ڈیل ڈول مردوں جیسا تھا۔ آواز اونچی اور گمبھیر اور رنگ سانولا جو غصے کی حالت میں سیاہ پڑ جایا کرتا۔ چنانچہ نوکر چاکر ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے تھر تھر کانپنے لگتے اور گھر بھر پر سناٹا چھا جاتا۔ ان کی اولاد میں سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں سن بلوغت کو پہنچ چکے تھے مگر کیا مجال جو ماں کے کاموں میں دخل دینا یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ بیگم صاحب پورے خاندان پر ایک ملکہ کی طرح حکمراں تھیں۔ عمر اور خوش حالی کے ساتھ ساتھ ان کی فربہی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور فربہی کے ساتھ رعب اور دبدبہ بھی۔

ان پندرہ برس میں جو انہوں نے اس نواح میں گزارے تھے، وہ یہاں کے قریب قریب سبھی رہنے والوں سے بخوبی واقف ہو گئی تھیں۔ بعض گھروں سے میل ملاپ بھی تھا اور کچھ بیبیوں سے دوستی بھی۔ وہ اس علاقے کے حالات سے خود کو باخبر رکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ املاک کی خرید و فروخت اور بنگلوں میں نئے کرایہ داروں کی آمد اور پرانے کرایہ داروں کی رخصت کی بھی انہیں پوری پوری خبر رہتی تھی۔

اس وقت بیگم تراب علی کی تیز نظروں کے سامنے مالی کا ہاتھ بڑی پھرتی سے چل رہا تھا۔ اس نے پودوں اور چھوٹے چھوٹے پیڑوں کی کاٹ چھانٹ تو قینچی سے کھڑے کھڑے ہی کر ڈالی تھی اور اب وہ اونچے اونچے درختوں پر چڑھ کر بیگم صاحب کی ہدایت کے مطابق سوکھے یا زائد ٹہنے کلہاڑی سے کاٹ کاٹ کر نیچے پھینک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بیگم صاحب بیٹھے بیٹھے تھک گئیں اور کرسی سے اٹھ کر بنگلے کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگیں۔ بنگلے کے آگے کی دیوار کے ساتھ ساتھ جو پیڑ تھے ان میں دو ایک تو خاصے بڑے تھے جن کی چھاؤں گھنی تھی خاص کر وہ لمبا بادام کا پیڑ۔ اس کا سایہ نصف بنگلے کے اندر اور نصف باہر سڑک پر رہتا تھا۔ دن کو جب دھوپ تیز ہو جاتی تو کبھی کبھی کوئی راہگیر یا خوانچے والا ذرا دم لینے کو اس کے سائے میں بیٹھ جاتا تھا۔

بیگم بلقیس تراب علی جیسے ہی اس پیڑ کے پاس پہنچیں ان کے کان میں دیوار کے باہر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ انہوں نے اس آواز کو فوراً پہنچان لیا۔ یہ اس علاقے کی مہترانی سگو کی آواز تھی جو اپنی بیٹی جگو سے بات کر رہی تھی۔ یہ ماں بیٹیاں بھی اکثر دوپہر کو اسی پیڑ کے نیچے سستانے یا شتہ پانی کرنے بیٹھ جایا کرتی تھیں۔

بیگم بلقیس تراب علی نے پہلے تو ان کی باتوں کی طرف دھیان نہ دیا۔ مگر ایکا ایکی ان کے کان میں کچھ ایسے الفاظ پڑے کہ وہ چونک اٹھیں۔ سگو اپنی بیٹی سے پوچھ رہی تھی، ''کیوں ری تو نے طوطے والی کے ہاں کام کر لیا تھا؟''

''ہاں'' جگو نے اپنی مہین آواز میں جواب دیا۔

''اور کھلونے والی کے ہاں؟''

وہاں بھی۔"

اور تپ دق والی کے ہاں؟

اب کے جگو کی آواز سنائی نہ دی۔ شائد اس نے سر ہلا دینے پر ہی اکتفا کیا ہوگا۔

"اور کالی میم کے ہاں؟"

اب تو بیگم تراب علی سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ بے اختیار پکار اٹھیں، "سگو۔ اری او سگو۔ ذرا اندر تو آئیو۔"

سگو کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کی باتیں کوئی سن رہا ہوگا۔ خصوصاً بیگم مقیس جن کی سخت مزاجی اور غصے سے اس کی روح کانپتی تھی۔ وہ پہلے تو گم سم رہ گئی۔ پھر مری ہوئی آواز میں بولی، "ابھی آئی بیگم صاحب!" تھوڑی دیر بعد وہ آنچل سے سینے کو ڈھانپتی، ہانپتی کانپتی، بنگلے کا پھاٹک کھول اندر آئی۔ جگو اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ دونوں ماں بیٹیوں کے کپڑے میلے چکٹ ہو رہے تھے۔ دونوں نے سر میں سرسوں کا تیل خوب لیسا ہوا تھا۔

"سلام بیگم صاحب!" سگو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کس قصور کی بنا پر اسے بیگم صاحب کے حضور پیش ہونا پڑا۔

بیگم صاحب نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا، "کیوں ری مردار یہ تو باہر بیٹھی کن لوگوں کے نام لے رہی تھی؟"

"کیسے نام بیگم صاحب؟"

"اری تو کہہ رہی تھی ناطوطے والی، کھلونے والی، تپ دق والی، کالی میم؟"

سگو نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "وہ تو بیگم صاحب ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے۔"

"دیکھ سگو سچ بتا دے ورنہ میں جیتا نہ چھوڑوں گی۔"

سگو پل بھر خاموش رہی۔ اس نے جان لیا کہ بیگم صاحب سے بات چھپانی مشکل ہوگی اور اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا "وہ بات یہ ہے بیگم صاحب ہم لکھت پڑھت تو جانتے نہیں اور ہم کو لوگوں کے نام بھی معلوم نہیں۔ سو ہم نے اپنی نسانی کے لئے ان کے نام رکھ لیے ہیں۔"

"اچھا تو یہ طوطے والی کون ہے؟"

"وہ جو بڑا سا گھر ہے نہ گلی گلی میں بگڑو والا۔۔۔"

"فاروق صاحب کا؟"

"جی بیگم صاحب وہی۔ ان کی بیوی نے طوطا پال رکھا ہے۔ ہم ان کو نسانی کے لیے طوطے والی کہتے ہیں۔"

"اور یہ کھلونے والی کون ہے؟"

"وہ جو میست کے برابر والے بنگلے میں رہتی ہیں۔"

بیگم تراب علی نے اس علاقے کا نقشہ ذہن میں جمایا، ذرا دیر غور کیا۔ پھر بولیں، "اچھا بخش الٰہی صاحب کا مکان؟"

"جی سرکار وہی۔"

"اری کمبخت تو ان کی "بیگم کو کھلونے والی" کیوں کہتی ہے۔ جانتی بھی ہے وہ تو لکھ پتی ہیں لکھ پتی، کھلونے تھوڑا ہی بیچتے ہیں۔"

"جب دیکھو ان کی کوٹھی میں ہر طرف کھلونے ہی کھلونے بکھرے رہتے ہیں۔ بہت بڑھیا بڑھیا کھلونے۔ یہ بڑے بڑے ہوائی جہاز۔ چلنے والی باتیں کرنے والی گڑیا۔ بجلی کی ریل گاڑی، موٹریں۔۔۔"

"اری موئی یہ کھلونے تو وہ خود اپنے بچوں کے کھیلنے کے لیے ولایت سے منگواتے ہیں، بیچتے تھوڑا ہی ہیں۔"

"ہم تو نسانی کے لیے کہتے ہیں بیگم صاحب۔"

"اور یہ کالی میم کس بی صاحب کا خطاب ہے؟"

وہ جو کرسٹان رہتے ہیں نا۔۔۔"

افسانے

''مسٹر ڈی فلوری؟''

''جی ہاں وہی۔''

''ہے کم بخت تیرا ناس جائے۔۔۔اور تپ دق والی کون ہے؟''

''ادھر کو'' سگو نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا'' وہ بڑی سڑک پر پہلی گلی کے نکڑ والا جو گھر۔اس میں ہر وکھت ایک عورت پلنگ پر پڑی رہے ہے اور میج پر بہت سی دواؤں کی سیسیاں نجر آوے ہیں۔''

بیگم صاحب بے اختیار مسکرا دیں۔ان کا غصہ اب تک اتر چکا تھا اور وہ سگو کی باتوں کو بڑی دل چسپی سے سن رہی تھیں کہ اچانک ایک بات ان کے ذہن میں آئی اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ماتھے پر بل پڑ گیے۔ڈانٹ کر بولیں:

''کیوں ری مردار تو نے میرا بھی تو کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا ہوگا۔بتا کیا نام رکھا ہے؟ سچ سچ بتائیو نہیں تو مارتے مارتے بر کس نکال دوں گی۔''

سگو ذرا ٹھٹکی مگر فوراً سنبھل گئی۔

''بیگم صاحب چاہے ماریئے چاہے جندہ چھوڑیے ہم تو آپ کو بیگم صاحب ہی کہتے ہیں۔''

''چل جھوٹی مکار!''

''میں جھوٹ نہیں بولتی سرکار چاہے جس کی قسم لے لیجیے۔۔۔ہم بیگم صاحب کو بیگم صاحب ہی کہتے ہیں نا؟''

جگو نے ماں کی طرف دیکھا اور جلدی سے منڈیا ہلا دی۔

''مجھے تو تم ماں بیٹیوں کی بات پر یقین نہیں آتا'' بیگم تراب علی بولیں۔اس پر سگو خوشامدانہ لہجہ میں کہنے لگی،''اجی آپ ایسی سکھی (سخی) اور گریب پرور ہیں۔بھلا ہم آپ کی سان میں ایسی گستاکھی کر سکتے ہیں۔'' بیگم صاحب کا غصہ کچھ دھیما ہوا اور انہوں نے سگو کو نصیحت کرنی شروع کی،''دیکھو سگو۔اس طرح شریف آدمیوں کے نام رکھنا ٹھیک نہیں۔اگر ان کو پتہ چل جائے تو تجھے ایک دم نوکری سے جواب دے دیں۔''

اچھا بیگم صاحب۔اس دفعہ تو ہمیں معاف کر دیں۔آگے کو ہم کسی کو ان ناموں سے نہیں بلائیں گے۔''

سگو نے جب دیکھا کہ بیگم صاحب کا غصہ بالکل اتر گیا ہے تو اس نے زمین پر پڑے ہوئے ٹھنوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''بیگم صاحب'' اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا، کھدا حجور کے صاحب اور بچوں کو سدا سکھی رکھے۔یہ جو دو ٹھنے آپ نے کٹوائے ہیں یہ تو آپ ہمیں دے دیجیے سرکار۔جھونپڑی کی چھت کئی دنوں سے ڈوبی ہوئی ہے۔اس کی مرمت ہو جائے گی۔گریب دعا دیں گے۔''

بیگم بلقیس تراب علی پہلے خاموش رہیں۔مگر جب سگو نے زیادہ گڑگڑانا شروع کیا تو پسیج گئیں۔

''اچھا اپنے آدمی سے کہنا اٹھا لے جائے۔''

''کھدا آپ کو سدا سکھی رکھے بیگم صاحب کھدا۔۔۔''

بیگم صاحب اس کی دعا پوری نہ سن سکیں۔کیونکہ ان کو ایک ضروری کام یاد آ گیا اور وہ بنگلے کے اندر چلی گئیں۔دو پہر کو بارہ بجے کے قریب سگو اور جگو سب کام نمٹا گھر جا رہی تھیں کہ سامنے ایک مہتر منڈاسا باندھے جھاڑو سے سڑک پر گرد و غبار کے بادل اڑاتا جلد جلد چلا آ رہا تھا۔دونوں ماں بیٹیاں اس کے قریب پہنچ کر رک گئیں،''آج بڑی دیر میں سڑک جھاڑنے نکلے ہو جگو کے باوا؟''

''ہاں جرا آنکھ دیر میں کھلی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ مہتر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی نے اسے روک لیا،''سن جگو کے باوا۔جب سڑک جھاڑ چکیو۔تو ڈھڈو کے بنگلے پر چلے جائیو۔وہاں دو بڑے بڑے ٹہنے کٹے پڑے ہیں انہیں اٹھا لائیو۔میں نے''ڈھڈو'' سے اجاجت لے لی ہے۔۔۔''

☆☆☆

افسانہ

صندل ہاتھ

ماہم اور مونا کی دوستی گریجویشن کے آخری سال میں ہوئی تھی' جب مونا نے اس کے کالج میں داخلہ لیا تھا، دونوں ہم مزاج اور ہم زبان تھے، اسی لئے بہت جلد گہرے دوست بن گئے، مونا ہاسٹل میں رہتی تھی جب کہ ماہم روز گھر سے کالج جاتی تھی، ویک اینڈ پر ماہم' مونا کو اپنے ساتھ گھر لے آتی، یوں دونوں کا وقت بہت اچھا گذرتا، مونا' ماہم کو اپنے آبائی گاؤں محبوب آباد کے رسم ورواج، شادی بیاہ کی تقاریب اور عیدین کے ہنگاموں کی تفصیل بتاتی' جن کے بارے میں سن کر ماہم کا دل چاہتا کہ وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ مونا کے والد وہاں کے جاگیردار تھے، یہ سلسلہ نسل درنسل چلا آرہا تھا، وہ لوگ بے شمار زرعی زمین کے مالک تھے، کاشتکاری ان کا خاندانی پیشہ تھا، کئی قول دار اور مزدور اُن کے کھیتوں میں کام کرتے تھے، انہیں اپنا اَن داتا سمجھ کر دل وجان سے ان کی عزت کرتے تھے۔ گریجویشن کے امتحان ختم ہوئے تو مونا اپنے گاؤں لوٹ گئی، جاتے جاتے ماہم کو اس بات پر راضی کرگئی کہ وہ اگلے ماہ اس کی بڑی بہن کی شادی میں شرکت کرنے گاؤں ضرور آئے گی۔ شادی سے دودن پہلے مونا نے ماہم کو فون پر اطلاع دی کہ میں کل دولہن کا زیور لینے حیدرآباد آرہی ہوں، واپسی پر تمہیں اپنے ساتھ گاؤں لے جاؤں گی، تیار رہنا۔

حسبِ وعدہ دوسرے دن ماہم نے مونا کے ساتھ محبوب آباد کے سفر کا آغاز کیا تو اُسے راستے بھر قدرت کے حسین نظارے دیکھنے کا پہلی بار موقع ملا، اونچے اونچے پہاڑ، گھنے جنگل، سبزے سے بھرے بڑے بڑے میدان' جنہیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی نے سبز رنگ کے قالین حدِ نظر تک بچھادئے ہوں، کھیتوں کے لامتناہی سلسلے جن پر اناج کی بالیوں سے لدے ہرے بھرے پودے دور دور تک لہلہارہے تھے، یہ سب کچھ ماہم نے پہلی بار دیکھا تھا۔

ماہم جب مونا کی حویلی پہنچی تو حیران رہ گئی، کیونکہ اس وضع کے گھر تو اس نے بس فلموں میں دیکھے تھے، حویلی میں قدم رکھتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے وہ زعفران کے کھیت میں آگئی ہو، ہر طرف پیلا ہی پیلا رنگ نظر آرہا تھا، گھر کے سارے مکین اور مہمان زرد رنگ کے لباس میں ملبوس تھے، یہاں تک کہ گھر کے ملازم بھی پیلے کپڑے پہنے دکھائی دے رہے تھے، گیندے کے پھولوں کی لڑیوں سے حویلی کی دیواریں اور ستون سجائے گئے تھے، تختوں پر بچھی ہوئی ساری چادریں اور دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے سارے پردے بھی زرد رنگ کے تھے۔

مونا نے ماہم کو بتایا کہ دولہن کو چار دن پہلے مایوں بٹھایا گیا تھا، آج اس تقریب کا آخری دن ہے، کل صبح صبح دولہا اور باراتی آجائیں گے اور شام ہونے سے پہلے پہلے دولہن کو رخصت کرا کے لیجائیں گے، گاؤں میں اب تک ''صبح تا نصف النہار'' دعوتوں کا رواج باقی ہے۔

سہ پہر دولہن کو ہلدی اور اُبٹن لگانے کی رسم منائی گئی، سات سہاگنیں مل کر یہ رسم انجام دیتی ہیں، دولہن کی والدہ سے اچھا خاصا نیگ وصول کر کے زیتون کے تیل میں گھولی گئی ہلدی اور زعفران ملے اُبٹن سے دولہن کے سارے جسم کی خوب مالش کی گئی، اس دوران دولہن کو چھیڑا جارہا تھا، ہنسی مذاق چل رہا تھا، قہقہے اُبل رہے تھے، صحن میں چنبیلی کے منڈوے تلے نوعمر لڑکیاں بیٹھیں ڈھولک پر وداعی کے میٹھے میٹھے گیت گارہی تھیں، بنّی اور بنّے کے گروپ بن گئے تھے جن کے درمیان نوک جھونک کا مقابلہ عروج پر تھا۔ گاؤں اور خاندان کی تجربہ کار خواتین باورچی خانہ سنبھالے بیٹھی تھیں، سات قسم کے تلن کئے جارہے تھے، سات انواع کے پکوان سے مہمانوں کا دسترخوان سجایا جارہا تھا۔ پورے گاؤں کی عام وخاص دعوت تھی، عورتیں اور بچے زنان خانہ میں آجارہے تھے، جبکہ مرد حضرت کی نشستوں اور طعام کا مردانے میں انتظام کیا گیا تھا، گاؤں کے مرد وخواتین تقریب میں اس خوش دلی سے حصہ لے رہے تھے کہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کون مہمان ہے اور کون میزبان۔

مونا ماہم کے ساتھ ساتھ تھی، اس کے پوچھے گئے سوالات کے جوابات دے رہی تھی، حویلی میں رات بھر پکوان چلتا رہا، صبح نو بجے باراتی دولہے کے ساتھ آن موجود ہوئے، ناشتے اور چائے سے تواضع کے بعد نکاح کی کاروائی کا آغاز ہوا، نکاح سے فارغ ہونے کا ''مبارک! سلامت!'' کے شور میں نوبت بجا کر اعلان کیا گیا، یہ ایک طرح کا نیوتہ تھا کہ دسترخوان بچھنے والا ہے، مہمان جلد سے جلد دولہن کے گھر آجائیں، اسی شور میں صبح تا نصف النہار کی ضیافت کا آغاز ہوا۔ سویرے سویرے دولہن کو نہلا کر سسرال سے آیا سہاگ کا جوڑا پہنایا گیا، گاؤں والوں میں رواج ہے کہ نکاح سے پہلے نہ دولہن کو زیور پہناتے ہیں اور نہ ہی سنگھار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ نکاح سے پہلے سنگھار کرنے سے دولہن پر نور نہیں آتا، ویسے نکاح کے بعد دولہن' دولہے والوں کی ملکیت ہوجاتی ہے، وہ جس طرح چاہے اُسے تیار کرلیں۔

نکاح کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر نندیں دولہن کو وداعی کے لئے تیار کرنے آتی ہیں، دولہن کی ماں سے بھاری نیگ لیکر دولہن کا سنگھار شروع کرتی ہیں، اس دوران مائیکہ والوں کو اس میں مداخلت کرنے یا انہیں مشورہ دینے کا کوئی حق نہیں ہوتا، سب سے پہلے دولہن کے بال سنوارے جاتے ہیں، دل بھر خوشبو والا تیل

لگانے کے بعد کس کر چوٹی گوندھی جاتی تا کہ سسرال پہنچ کر بھی دولہن کا ایک بال بھی ادھر سے ادھر نہ ہو، چوٹی کے بعد زیور کی باری آتی ہے، گلے میں ہار، ہاتھوں میں کھوبڑا اور کنگن پہنانے کے بعد کانوں میں موٹی موٹی ڈنڈی کے جھمکے پہنا کر کان سرخ کردیے جاتے ہیں، پندرہ بیس دن پہلے چھدوائی گئی ناک کی چھید میں سوا تولے کی موتیوں سے جڑی نتھ پہنائی جاتی ہے، بیچاری دولہن کی ناک سے لال لال خون رسنے لگتا ہے، اور مارے درد کے آنکھوں سے بے رنگ پانی آنسوؤں کی شکل میں بہتا ہے، لیکن ہونٹوں پر اُف تک نہیں آتی، دولہن کی اس تکلیف پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی، نندوں کو تو بھاوج کی قوتِ برداشت کا امتحان لینا ہوتا ہے کہ دیکھیں دولہن میں صبر و ضبط کا کتنا مادّہ ہے، آگے زندگی میں کوئی تکلیف آئے تو اس کا سامنا کر پائے گی کہ نہیں۔

دولہن کو تیار کرنے کے بعد دولہا کو آرسی مصحف کے لئے زنان خانے میں بلایا جاتا ہے، سب سے پہلے اُن کا سسرالی خواتین سے تعارف کروایا جاتا ہے، بے چارے دولہا میاں سر تسلیم خم کر کے سب کو احتراماً جھک جھک کر سلام کرتے ہیں، ان میں سے کئی خواتین ایسی بھی ہوتی ہیں جو عمر میں ان سے چھوٹی لیکن رشتے میں ان سے بڑی ہوتی ہیں، اس لئے دولہا میاں سب کا ایک جیسا احترام کرتے ہیں۔ خواتین سے تعارف کے بعد دولہا میاں کو دولہن کے قریب مسند والے تخت پر بٹھایا گیا، دونوں کے درمیان ایک شیشہ رکھ کر دونوں کے اوپر سے دولہن کا گھونگھٹ اُڑھا دیا گیا، خاندان کی ایک معمر خاتون نے گھونگھٹ کے اندر دولہن کا چہرہ دولہے کو دکھایا، دولہا میاں نے دولہن کو دیکھنے کے بعد منہ دکھائی کی انگوٹھی پہنائی، اس کے بعد دولہن کو دولہے کا چہرہ شیشہ میں دکھایا گیا، بزرگوں کا ماننا ہے کہ شیشہ میں دولہا دولہن کا ایک دوسرے کو دیکھنا نیک شگون ہوتا ہے کہ زندگی بھر دونوں اپنے آپ سے زیادہ شیشہ میں دیکھے گئے چہرے کا خیال رکھتے ہیں۔

ایک بڑے سے کٹورے میں دودھ ڈال کر لایا جاتا ہے جس پر ایک خاتون سورۂ والشمس پڑھ کر دم کرتی ہیں اور اس دودھ سے دو گھونٹ پہلے دولہا میاں کو پلایا جاتا ہے اس کے بعد دولہے کا جھوٹا دودھ دولہن کو پلاتے ہیں جو دونوں میں مزید قربت کا باعث بنتا ہے۔ اس رسم کے بعد دولہا دولہن کو وداعی کے پھول پہنائے جاتے ہیں، دولہن کے والد بیٹی کا ہاتھ دولہے کے ہاتھ میں دے کر سکھ دُکھ میں ہمیشہ ساتھ دینے کا وعدہ لیتے ہیں اس کے بعد سلامیوں کا سلسلہ چلتا ہے، دولہا میاں ہر سلامی کے بعد اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر ادب سے سلام کرتے ہیں، چاہے وہ سلامی پڑوسن کی دی ہوئی پچاس روپے اور ایک تولہ ہی کیوں نہ ہو، آخری سلامی ساسی کی ہوتی ہے، چاندی کی تھالی میں بریانی ہوتی ہے جو بڑے احترام سے دولہا میاں قبول کرتے ہیں یہ مستقبل میں سسرال میں کی جانے والی ضیافتوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ سلامیوں سے فارغ ہونے کے بعد دولہے کی بہن نہ جانے اُن کے کان میں کیا کہا کہ وہ تنہا اُٹھ کر اپنے دوست کے ساتھ مردانے میں چلے گئے۔

ماہم نے پریشان ہو کر پوچھا: ''اب کیا ہوگا؟''

''اب رخصتی سے پہلے کی سب سے اہم رسم ہوتی ہے، دولہن کے بزرگ، والد اور بھائی دولہن کو صندل ہاتھ دے کر مائیکہ سے رخصت کرتے ہیں۔'' ماہم بڑی دلچسپی سے ہونے والی رسم دیکھنے کی منتظر تھی۔

ایک کشتی میں رکھے بڑے سے پیالے میں عطر اور صندل کے آمیزے میں پان رکھ کر دولہن کے سامنے رکھتے ہیں، سب سے پہلے دولہن کے نانا آتے ہیں، انہوں نے پان کا پتہ صندل میں بھگو کر دولہن کے مہندی لگے دونوں پیروں پر صندل لگایا اور کچھ کھٹکھٹاتے سکّے دولہن پر سے وار کر کشتی میں ڈالے اور کہا: ''بیٹی! جس طرح تم عزت کے ساتھ ہمارے گھر سے وداع ہو رہی ہو اسی طرح سسرال میں بھی اپنے حسن سلوک سے ہماری عزت کو بڑھا کر ہمیں سُرخ رو کرنا۔'' دولہن کے نانا کے بعد والد، چاچا، ماموں، خالو اور دولہن کے بھائیوں نے بھی اس رسم کو دُہرایا اور دولہن کو اپنے اپنے انداز میں دعائیں دیں۔

ماہم مونا کے ساتھ دولہن کے بالکل قریب کھڑی اس عجیب و غریب رسم کو غور سے دیکھ رہی تھی جو خاندان کے مرد حضرات ہی ادا کر رہے تھے، اس میں خواتین کا کوئی دخل نہیں تھا، ماہم حیران تھی کہ یہ کیسی رسم ہے جس میں خاندانی بزرگ دولہن کے پاؤں چھو رہے تھے؟

''اس رسم کا کیا مطلب ہے؟'' ماہم نے اپنی سہیلی سے پوچھا۔

''یہ بیٹی کو وداع کرنے سے پہلے کی بڑی خاص رسم ہوتی ہے جس میں دولہن کے سارے قریبی مرد رشتہ دار دولہن کو صندل ہاتھ دے کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ تم نے ہمیں اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق عزت سے وداع کرنے کا موقع دے کر خاندان قبیلے اور گاؤں بھر میں ہماری لاج رکھ لی، خدانخواستہ! اگر تم کوئی ایسی ویسی حرکت کرتیں یا اپنی پسند کی شادی کے لئے کسی لڑکے کے ساتھ فرار ہو جاتیں تو ہم خاندان کے مردوں کے لئے ڈوب مرنے کی بات ہوتی۔'' مونا نے بتایا۔

مونا کی زبانی یہ باتیں سن کر ماہم کا وہاں کھڑا رہنا دشوار ہو گیا، اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور سر چکرانے لگا، بڑی مشکل سے وہ وہاں سے دولہن کے خالی

کمرے میں آئی اورخزاں کے آخری زرد پتے کی طرح تخت پر گر گئی۔

''میرے اللہ!'' وہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی، ''مجھے معاف کردے، میرے مالک! یہ میں کیا کرنے جارہی تھی؟'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روتی رہی، ''آج اگر میں اس شادی میں شرکت نہ کرتی تو اپنے بیہودہ منصوبے پر عمل کر کے نہ دین کی رہتی نہ دنیا کی، مجھے یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ میں کتنا سنگین گناہ کرنے جارہی تھی، اچھا ہوا جو مجھے وقت پر ہوش آ گیا۔''

ماہم اپنے کالج کے ایک جونیئر لکچرر سے محبت کرنے لگی تھی، وجیہی نہ صرف نام کا وجیہی تھا بلکہ اس کی شخصیت بھی وجاہت سے بھر پور تھی، خوش مزاج، خوش لباس اور خوش گفتار، تب ہی تو وہ سوجان سے اس پر فداء ہوگئی تھی، وجیہی نے دوسال پہلے اسی کالج سے اپنی تعلیم مکمل کی تھی، اس کی قابلیت کے باعث جب اُسے کالج انتظامیہ نے لکچررشپ کا جاب آفر کیا تو اس نے بخوشی منظور کرلیا، سوچا کہ تجربہ کی خاطر دوایک سال اسی کالج میں جاب کرلیں تو کیا بُرا ہے۔

خوبصورت قد وخال، سونے جیسا چمکتا رنگ، اپنے آپ کو دوسروں میں منفرد منوانے کے ہنر میں ماہر، ماہم کو جب وجیہی نے دیکھا تو وہ بھی اُسے پسند کرنے لگا، پسندیدہ جنسِ مخالف جب روز روز ایک دوسرے کے سامنے آئے تو پسندیدگی کا تاثر محبت میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔

ایک دن وجیہی نے ماں کے سامنے ماہم کو کھڑا کر کے کہا: ''امی! مجھے یہ لڑکی پسند ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

ماں کو بھی ماہم ایک ہی نظر میں پسند آگئی، انہوں نے ماہم کی بلائیں لیتے ہوئے خوش دلی اور شفقت سے کہا: ''ماشاءاللہ! بہت پیاری ہے، میرا بیٹا بھی کسی سے کم نہیں، بالکل چاند اور سورج کی جوڑی لگے گی۔''

ماہم نے وجیہی کو اپنے والدین سے ملایا تو وہ بھی اس رشتے کے لئے راضی ہوگئے، ماہم اور وجیہی کا سنہرا خواب تو اس وقت ٹوٹا جب دونوں کے والدین کو پتہ چلا کہ ماہم سُنّی لڑکی ہے اور وجیہی شیعہ لڑکا ہے، تو دونوں کے والدین نے رشتے سے انکار کردیا، ماہم اور وجیہی نے اپنے اپنے والدین کو راضی کرنے کی جان توڑ کوشش کی، لیکن وہ کسی طرح رضامند نہیں ہوئے۔ وجیہی کے والد نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تم اگر کسی غیر مسلم لڑکی کو پسند کر لیتے تو ہم خوشی سے اُسے اپنی بہو بنا لیتے، لیکن ایک سُنّی لڑکی کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اُسے اگر کوئی نعمت آسانی سے میسر آجائے تو اس کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوتا، لیکن جس مقصد کے حصول میں دشواری پیش آئے تو انسان کی طلب میں پاگل پن شامل ہوجاتا ہے، ماہم اور وجیہی نے فیصلہ کرلیا کہ دونوں اپنے اپنے والدین کے خلاف جا کر بھی شادی ضرور کریں گے۔

مونا کے ساتھ شادی میں شرکت کے لئے گھر سے نکلنے سے پہلے دونوں نے پلان بنایا کہ وہ شادی سے گھر واپس آنے کے بجائے بمبئی کے لئے روانہ ہوجائیں گے جہاں وجیہی کے دوست نے ان کے قیام اور شادی کا سارا انتظام اپنے ذمہ لے لیا تھا، دونوں کا خیال تھا کہ ایک بار شادی ہوجائے تو ان کے والدین کو انہیں معاف کر کے اپنانا ہی ہوگا۔ شادی میں صندل ہاتھ کی رسم دیکھنے سے پہلے ماہم کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے گھر سے فرار ہوجانے کے بعد گھر کے مکینوں اور خاندان والوں پر کیا کچھ گذرے گی، ایسے رسم و رواج لڑکیوں کی عملی تربیت کا ایک بہترین ذریعہ ہیں جسے لڑکیاں مثبت انداز میں قبول کرتی ہیں اور شرعی حدود کو پھلانگنے کی کوشش نہیں کرتیں۔

ماہم نے سوچا میرے وہ والدین جو مجھے دنیا میں لانے کا سبب بنے، جنہوں نے پال پوس کر مجھے بڑا کیا، پڑھا لکھا کر قابل بنایا، میں انہی کی نافرمانی میں اتنا سنگین قدم اٹھانے جارہی تھی، مجھ سے تو گاؤں کے ماحول میں پلی بڑھی کم تعلیم یافتہ لڑکی لاکھ درجہ بہتر ہے، جو اپنے خاندان کے مرد حضرات کی سرپرستی میں عزت و آبرو سے رخصت ہو رہی ہے، اس نیک اور پاکیزہ لڑکی کے قدموں کو چھو کر اس کے محافظ اس کا احسان مان رہے ہیں کہ اس نے انہیں سارے خاندان، قبیلے اور گاؤں میں سُرخرو ہونے کا موقع دیا۔

میرے والدین کو جب میرے بارے میں پتہ چلے گا کہ میں نے گھر سے بھاگ کر وجیہی کے ساتھ شادی کرلی ہے تو وہ جیتے جی مر جائیں گے، میرے غیرت مند بھائی تو مارنے مرنے پر تیار ہوجائیں گے، میری بہنوں کا ان کے سسرال میں جینا دوبھر ہوجائے گا، میری بھابیاں میرے بھائیوں کو میری بدچلنی کے طعنے دے دے کر اُن کا سر شرم سے جھکا دیں گی، میری ذات پر صرف میرا اپنا حق تو نہیں جو میں اپنی مرضی سے اپنے بارے میں فیصلہ کروں، میں رشتوں میں کئی لوگوں سے جُڑی ہوئی ہوں، جن کی مرضی کا احترام کرنا میرا اولین فرض ہے، یہ سوچ سوچ کر اس کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ مونا نے ماہم کو اپنے قریب نہ پایا تو متلاشی نظروں سے آس پاس دیکھا، جب وہ وہاں نظر نہ آئی تو اُسے ڈھونڈتی دولہن کے کمرے میں آئی، اُسے رو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''کیا ہوا ماہم؟ یہاں کیوں آگئی؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ یہ تم رو کیوں رہی ہو؟'' اس نے ایک ساتھ کئی سوال کر دئے۔

''کچھ نہیں! زیبا کی رخصتی کی رسم دیکھ کر میرا دل بھر آیا، کیا سب ہی لڑکیوں کو اسی طرح اپنے ابو اور امی کو چھوڑ کر جانا ہوتا ہے؟ اس خیال کے ساتھ ہی مجھے امی ابو کی یاد نے تڑپا دیا۔'' ماہم رُکیر آواز میں بولی۔

''اچھا!'' مونا ہنستے ہوئے بولی، ''صرف دو دن ان سے دور رہ کر تمہارا یہ حال ہو گیا، شادی کے بعد ان سے جدا کیسے رہو گی؟ اور اگر میاں کے ساتھ پردیس جانا ہوا تو؟''

''مونا! میں جلد سے جلد گھر جانا چاہتی ہوں، صبح حیدرآباد جانے والی بس کب ملے گی؟'' ماہم نے اس کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیوں کیوں؟'' مونا نے جلدی سے پوچھا، ''تم تو ولیمہ کے بعد واپس جانے والی تھیں؟''

''میں دو دن اور نہیں رہ سکتی، جتنی جلد ممکن ہے مجھے گھر واپس جانا ہے، صبح پہلی بس کب نکلتی ہے؟'' ماہم نے اصرار کیا۔

تو مونا نے اُسے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا: ''صبح چھ بجے!''۔

''مجھے صبح کی بس میں سوار کروا دو نا پلیز!'' ماہم نے عاجزی سے کہا، تو مونا نے غیر ارادی طور پر اثبات میں گردن ہلا دی۔

دوسرے دن دوپہر کو جب ماہم اچانک گھر پہنچی تو اپنی ماں سے لپٹ کر رونے لگی، اس کی ماں نے حیران و پریشان خود سے لپٹی بیٹی کے سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا: ''کیا ہوا میری جان! کیوں رو رہی ہو؟''

''کچھ نہیں امی! آپ کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا، مجھے وعدہ کریں کہ مجھے اس طرح اکیلے کہیں بھی نہیں جانے دیں گی، اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو؟'' ماہم نے روتے ہوئے پوچھا۔

''پگلی! تم اتنی کم ہمت نکلو گی یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' اس کی امی نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا، ''بس اب یہ رونا بند کرو، اپنے ابو کے آنے سے پہلے نارمل ہو جاؤ۔''

''بات کم ہمتی کی نہیں امی! بات تو غیر معمولی ہمت کی تھی، اچھا ہوا جو مجھے وقت پر ہوش آ گیا، ورنہ آپ کی یہ محبت نفرت میں بدل جاتی۔'' ماہم نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے دل میں سوچا، لیکن زبان سے کچھ نہ بولی۔

ماہم کی امی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے دیوان پر بٹھایا اور اس کے بال سنوارے اور اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر اُن پر بوسہ دیا اور بولیں:

''خواہ مخواہ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہو، ٹھہرو میں تمہارے لئے پانی لاتی ہوں۔''

ماں کچن سے پانی کا گلاس لے آئیں اور اُسے پیار سے پلانے لگیں، ماں کی پُر وقار شخصیت اور ان کے نورانی چہرے پر چھائے ممتا کے بے لوث جذبے کو شکر گذاری سے دیکھتے ہوئے ماہم نے ایک مقبول ترین حج کا ثواب حاصل کر لیا، احسانمندی محسوس کرتے ہوئے ماہم کی آنکھیں دوبارہ چھل چھل ہو گئیں۔

''تم پھر شروع ہو گئیں؟'' ماں نے نرمی سے سرزنش کی، ''چلو! اب آنسو بہانا بند کرو۔''

''انہیں پینے دو امی!'' ماہم نے اپنی ماں کے دونوں ہاتھ تھام کر اُن پر بوسہ دے کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور اُن کے سینے سے لگ کر بولی:

''یہ ندامت کے وہ آنسو ہیں جن کے بارے میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے فرمایا تھا: ؎

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چُن لئے
آنسو جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

☆☆☆

شبانہ اقبال
مکان نمبر: 8-1-21/9، سوریا نگر کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد۔ 500 008
موبائل: 9618559318

افسانے

غزلیں

صلاح الدین نیّر

جہاں بھی میں رہوں اپنے اثر میں رہنے دے
بہت دنوں سے ہوں گھر میں سفر میں رہنے دے

مجھے تو اور بھی اونچی اڑان بھرنا ہے
کچھ اور دن کے لیے بال و پر میں رہنے دے

قدیم رشتہ ہے میں تیرے گھر بھی آؤں گا میں
کچھ اور دن تو مجھے میرے گھر میں رہنے دے

اِسی لیے میں تِرے آس پاس رہتا ہوں
جہاں بھی میں رہوں' اپنی نظر میں رہنے دے

تجھے خبر نہیں پھولوں کا سلسلہ ہوں میں
مری بھی خوشبو' نسیم سحر میں رہنے دے

مجھے یہاں میرے اپنوں کی خوشبو آتی ہے
کچھ اور دن انہی دیوار و در میں رہنے دے

مجھے خود اپنے ہی کچھ فیصلے بھی کرنے ہیں
جنوں کی لہر ابھی میرے سر میں رہنے دے

تمام زندگی نیّر سکوں سے جی لوں گا
وطن کی خوشبو کو رختِ سفر سفر میں رہنے دے

○◯○

مکان نمبر: ,11-3-824/7 کہکشاں' اولڈ ملے پلی'
حیدرآباد۔500001 موبائل نمبر: 9618334457

قاضی فاؔروق عارفی

مایوس مقدر سے ہوا ہے' نہ ہوا ہوں
امید کی منزل پہ ہمیشہ میں کھڑا ہوں

منصف کی نظر میں ہوئے معصوم بھی مجرم
یہ کیسی عدالت ہے؟ میں کیا دیکھ رہا ہوں

کانٹوں پہ بھی چلنے کا ہنر جان لیا ہے
منزل کو پہنچنے کے لئے کب میں رکا ہوں

آنکھوں میں مری روشنی باقی ہے ابھی تک
یہ بات الگ ہے کہ میں اک بجھتا دیا ہوں

حق گوئی کا بدلہ مجھے کچھ ایسا ملا ہے
اپنوں کی نگاہوں میں بھی اب چبھنے لگا ہوں

احساس مجھے زیست کا ہر لمحہ ہوا ہے
بستی میں مسیحاؤں کی میں جب سے رہا ہوں

دنیا کے بدلتے ہوئے حالات جو دیکھا
با فضل خدا اپنے ہی پیروں پہ کھڑا ہوں

احساس سکوں دل کو مرے ملتا رہا ہے
اللہ ترے بندوں کی جو خدمت میں لگا ہوں

ہے شکر خدا میرا ضمیر اب بھی ہے زندہ
مظلوم کی آواز پہ آواز دیا ہوں

فاروؔق مرے خون کی تاثیر یہی ہے
ورثہ میں شرافت ملی' خوددار رہا ہوں

○◯○

مکان نمبر: ,6 & 18-1-364/5 'فلاٹ نمبر 401' چوتھی منزل'
پرلس ریسیڈنسی' ڈیلکس کالونی' ٹولی چوکی' حیدرآباد۔ 500008

غزلیں

ڈاکٹر راہیؔ

نذر علامہ اقبالؔ

وفا کی بات لے کر اُٹھ، جہاں پر تو عیاں ہوجا
کچل دے قوت باطل کو حق کا ترجماں ہوجا

ترے ہی دم سے قائم ہے وقار نسل انسانی
ذرا ہوشیار بن، انسانیت کا پاسباں ہوجا

سمجھ میں آئے گا تجھ کو بھی اک دن راز ہستی کا
یہ مانا ایک قطرہ ہے تو بحر بے کراں ہوجا

لپٹ جائے گی قدموں سے کبھی تو خود تری منزل
شعور کارواں تو ہے خواب کارواں ہوجا

تری تدبیر ہی تو اصل میں تقدیر ہے ناداں
بدل کر دار کو اپنے عمل کا اک جہاں ہوجا

حقیقت کو سمجھ اپنی حصار ذات سے ہٹ کر
تو اپنے سے مگر راہیؔ نہ اتنا بدگماں ہوجا

○◯○

ریڈیینٹ کلینک، مغل پورہ کمان،
حیدرآباد۔ 500002

فصیح احمد ساحرؔ

خموش رہنے سے بہتر ہے بولتے رہئے
سدا وجود کو اپنے ٹٹولتے رہئے

ضمیر جو بھی کہے اس کو مانئے لیکن
کچھ اس میں رنگ سیاست گھولتے رہئے

کوئی کرے نہ کرے آپ خود کریں تعریف
حصار ذات کے اندر ہی ڈولتے رہئے

عجب نہیں کہ حکومت کے کان بھی سن لیں
بس ایک بات کو ہر لحظہ بولتے رہئے

یہ حل طلب ہے ابھی تک کہ زندگی کیا ہے
یہ گتھی عقل کے ناخن سے کھولتے رہئے

پرانے رنگ سبھی پھیکے پڑ گئے ساحرؔ
غزل میں آپ نئے رنگ گھولتے رہئے

○◯○

17، اے پی سی روڈ، کولکاتہ۔9
موبائل: 9748193853

خبرنامہ

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی جانب سے اُردو مصنفین کی سال 2021ء کی مطبوعات پر انعامات
جناب محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کا بیان

حیدرآباد۔ 11/ نومبر 2022ء ریاست تلنگانہ کے اردو شعرا' ادیبوں اور مصنفین کی سال 2021ء کے دوران شائع شدہ مطبوعات پر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کی جانب سے انعامات عطا کئے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں جناب محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی نے اپنے صحافتی اعلامیہ میں بتایا کہ اُردو اکیڈیمی کی اسکیم ''مطبوعات پر انعامات'' کے تحت شاعری' فکشن' طنز و مزاح' بچوں کا ادب' تحقیق و تنقید اور متفرق زمروں میں انعامات دیئے جائیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ مطبوعات کو انعام کے لئے منتخب کرنے تمام زمروں کے ماہرین پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔ صدر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی نے بتایا کہ مطبوعات پر انعامات کے لئے درخواست گذار اپنی 5 مطبوعہ کتابیں درخواست اور تمام تفصیلات کے ساتھ 30 نومبر 2022ء تک صدر دفتر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی' چوتھی منزل حج ہاوز نامپلی حیدرآباد میں داخل کریں۔ انہوں نے بتایا کہ مطبوعہ کتابیں ڈیمائی سائز کی کم از کم 96 صفحات پر اور کراؤن سائز کی کم از کم 112 صفحات پر مشتمل ہونی چاہئیں۔ مولفہ و مرتبہ کتابوں میں ڈیمائی سائز کی مطبوعہ کتاب میں کم از کم پندرہ (15) صفحات کا مقدمہ اور کراؤن سائز کتاب میں بیس (20) صفحات کا مقدمہ شریک نہ ہو تو کتاب کو انعام کے لئے غور نہیں کیا جائے گا۔ صدر اردو اکیڈیمی جناب محمد خواجہ مجیب الدین نے بتایا کہ کتابوں کو انعام کے لئے منتخب یا مسترد کرنے کا اختیار تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کو ہوگا۔ انہوں نے مزید بتایا گیا ہے کہ درخواست کا پروفارما صدر دفتر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی چوتھی منزل حج ہاؤز نامپلی حیدرآباد سے حاصل کیا جاسکتا ہے یا پروفارما کی زیراکس کاپی بھی قابل قبول ہوگی۔

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کی جانب سے ریاست تلنگانہ کے اُردو مصنفین کی تخلیقات برائے سال 2021ء کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت جناب محمد خواجہ مجیب الدین صدر ریاستی اُردو اکیڈیمی کا بیان

حیدرآباد۔ 12/نومبر 2022ء تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی جانب سے ریاست تلنگانہ کے اردو مصنفین' ادبا' شعراء' صحافیوں اور قلم کاروں کی سال 2021 کی اردو تخلیقات کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت کی جارہی ہے۔ جناب محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی نے اپنے صحافتی بیان میں ریاست تلنگانہ کے اردو قلم کاروں سے خواہش کی ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کے مسودات 12/ ڈسمبر 2022ء تک صدر دفتر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی حج ہاوز چوتھی منزل نامپلی میں داخل کردیں۔ انہوں نے اس اسکیم کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا ہے کہ مسودہ بعد طباعت 1/8 ڈیمائی سائز کے 96 صفحات پر اور 1/16 کراؤن سائز کے 112 صفحات پر مشتمل ہونا چاہئے۔ اگر کوئی کتاب مرتب کی گئی ہو تو اس کا مقدمہ کم از کم 20 صفحات پر مشتمل ہو۔ مخطوطات پر تدوین کی صورت میں 30 صفحات پر مشتمل سیر حاصل تبصرہ بھی اس میں شامل ہونا چاہئے۔ صحافتی بیان میں بتایا گیا کہ مالی اعانت کے لئے درخواست گذار اپنی درخواست کے ساتھ اردو اکیڈیمی کا جاری کردہ پروفارما پُر کرکے اس کے ساتھ' آدھار کارڈ کی کاپی' بینک پاس بک یا چیک کی زیراکس کاپی اور ایک عدد پاسپورٹ سائز فوٹو بھی لازمی طور پر داخل کریں۔ اعلامیہ میں بتایا گیا ہے کہ ادیب/شاعر/مرتب کے مسودہ کی نقل (Xerox) خوش خط یا ڈی ٹی پی کی کاپی داخل کریں۔ جناب محمد خواجہ مجیب الدین نے بتایا کہ درخواست میں کتاب کا جو عنوان اور موضوع درج کیا گیا ہے وہی تفصیلات کتاب پر بھی درج ہونی چاہئیں۔ موضوع اور عنوان میں تبدیلی قابل قبول نہیں ہوگی۔ انہوں نے مزید بتایا کہ درخواست گذار مسودہ کی زیراکس کاپی اپنے پاس رکھیں' اس لئے کہ اُن کا داخل کردہ مسودہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

Urdu Monthly
Qaumi Zaban
AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY
Vol. 07 No. 11 November 2022

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622
Date of Publication : 15th of every month

RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022
Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

عالیجناب کے۔ چندراشیکھر راؤ
عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ

جناب محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

جناب کوپُّلہ ایشور
عزت مآب وزیر برائے شیڈولڈ کاسٹ ڈیولپمنٹ، اقلیتی بہبود و بہبودیٔ معذورین و معمر شہریان
حکومت تلنگانہ

عظیم مجاہد آزادی، مایہ ناز خطیب، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد جنہوں نے وزارت تعلیم کا عہدہ حاصل کرتے ہی تعلیم کے فروغ کے لئے کئی ادارے قائم کئے جن میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، تعلیم بالغان، کونسل برائے ٹیکنیکل ایجوکیشن، سنٹرل ایجوکیشن بورڈ اور بھی کئی ادارے قائم ہوئے۔ مولانا آزاد کی ان کی تعلیمی اصلاحات کی وجہ سے تعلیم میں زبردست انقلاب آیا۔ مولانا آزاد کی ان عظیم تعلیمی خدمات کو خراج پیش کرنے حکومت ہند نے اُن کی یوم پیدائش 11/ نومبر کو "یوم قومی تعلیم" قرار دیا ہے۔

اس دن کو یادگار بنانے ہم عہد کریں کہ تعلیم کو عام کریں گے، خود بھی تعلیم حاصل کریں گے
اور اپنے نونہالوں کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں گے۔

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone: 040-23237810, 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation Website: www.urduacademyts.com